طلوعِ اسلام

دسمبر
سنہ ۱۹۵۴ء

پاکستان میں نظام شریعت رائج ہونا چاہئے -

لیکن یہ نظام شریعت ہوگا کیا ؟

(۱) اقتدار اعلیٰ خدا کا - اطاعت صرف اس کی -

(۲) خدا کی اطاعت کے معنی ہیں اسکی وحی کی اطاعت -

(۳) ایک وحی قران میں ہے - لیکن وہ مجمل ہے -

(۴) اس اجمال کی تفصیل دوسری وحی میں ہے جس کا نام احادیث ہے-

(۵) لہذا خدا کی اطاعت سے مراد احادیث کا اتباع ہے -

لیکن.... احادیث غلط بھی ہیں اور صحیح بھی -

یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی ؟

یہ صرف.... مزاج شناس رسول بتا سکتا ہے ؟

یہ مزاج شناس کون ہیں ؟

اسکی تفصیل ادارہ طلوع اسلام کی تازہ ترین پیشکش

مزاج شناس رسول

میں دیکھئے - ضخامت ۴۴۸ صفحات - مجلد معہ گرد پوش -

قیمت -/۴ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

چندہ ختم ہونے کا سرخ نشان

پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳　　کراچی

بدل اشتراک	مرتب	قیمت فی پرچہ
سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی) ، ، غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ	سعید احمد	دس آنے (پاکستانی) بارہ آنے (ہندوستانی)

نمبر ۱۲	دسمبر ۱۹۵۴ء	جلد ۷

فہرست مضامین

لمعات	۴-۱۳	۲۔ جمعہ کی چھٹی	
ہفتہ وار طلوع اسلام	۱۴-۱۷	۳۔ وفاتِ مسیحؑ	
ہمارا اور آپ کا مشترکہ مفاد	۱۸	۴۔ چودھری محمد ظفر اللہ خان صاحب کا جواب	
سلیم کے نام	۱۹-۳۳	نقد و نظر	۶۰-۶۳
(محترم پرویز صاحب)		۱۔ بیناتِ باہرات	
اسلام پر مختلف غیر اسلامی ثقافتوں کے اثرات	۳۵-۵۰	۲۔ عہدِ فاطمی میں علم و ادب	
(علامہ محترم احمد امین صاحب)		۳۔ اسلام اور غلامی	
مذہب اور سیاست	۵۱-۵۵	۴۔ تعلیم	
باب المراسلات	۵۶-۵۹	رفتارِ عالم	۶۴-۷۳
۱۔ غلط معاشرہ میں اصول پرستی		دیکھئے اپنا خریداری نمبر تلاش کیجئے	۷۳

نہایت اہم اعلان: ادارہ طلوع اسلام نے اب ڈاکخانہ میں پوسٹ بکس نمبر حاصل کر لیا ہے لہذا آئندہ خط و کتابت کیلئے پتہ یہ ہوگا۔
ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی
یاد رکھئے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

وحی اور عقل دونوں کے پیش نظر انسانی مسائل کا حل ہوتا ہے۔ وحی کے سامنے چونکہ حقائق بے نقاب ہوتے ہیں اور اس کی بنیاد علم پر ہوتی ہے اس لئے وہ ان مسائل کا یقینی حل پیش کرتی ہے جس میں ظن و قیاس کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس عقل قیاس پر چلتی ہے اور اس کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔ وہ ایک حل کو تجویز کرتی ہے۔ پھر اس پر تجربہ کرتی ہے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہے۔ ان ٹھوکروں سے اس کا خون بہتا ہے، ہڈیاں ٹوٹتی ہیں، اس کے بعد پتہ چلتا ہے کہ قدم غلط سمت کو اُٹھا تھا۔ وہ اس ناکام تجربہ کو چھوڑ کر پھر دوسری طرف قدم اٹھاتی ہے۔ اس طرح وہ ٹکریں مارتی اور ٹھوکریں کھاتی جب آخر الامر کسی یقینی نتیجہ پر پہنچتی ہے تو پھر معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو وہی منزل ہے جس کا تعین وحی نے پہلے ہی کر دیا تھا۔ وحی کا عقل سے یہی کہنا ہوتا ہے کہ تم میرے پیش کردہ حل کو صحیح تسلیم کر کے اسی سمت کو چل نکلو۔ تجربہ تمہیں خود بتا دیگا کہ یہی راستہ امن و سلامتی کا اور یہی منزل فوز و فلاح کی تھی۔

وحی کو انسانی مسائل کے جو حل تجویز کرنے تھے انھیں آخری مرتبہ قرآن میں محفوظ کر دیا گیا اور اس طرح وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب جو لوگ ان مسائل کا حل وحی کی رو سے دریافت کرنا چاہتے ہیں انھیں قرآن پر غور و فکر کرنا ہوگا۔ جو قوم ایسا کرے گی وہ ان تباہیوں اور بربادیوں سے بچ جائے گی جو عقل کے تجرباتی طریق کا لازمی نتیجہ ہے۔ طلوع اسلام اسی روش کا داعی ہے۔ وہ انسانی مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اسی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اس وقت تک تجربہ نے بتایا ہے کہ وہ لوگ جو اس روش کو چھوڑ کر اپنے قیاسات کی روشنی میں چل نکلتے ہیں اور طلوع اسلام انھیں ان کی غلط روش سے آگاہ کرتا ہے، انھیں ٹھوکریں کھا کر اور ٹکریں مار کر بالآخر اسی راستہ پر آنا پڑتا ہے جو قرآن نے تجویز کیا تھا اور جس کی طرف طلوع اسلام نے دعوت دی تھی۔

تشکیل پاکستان کے بعد طلوعِ اسلام نے اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق منجملہ دیگر امور، یہ بھی کہا تھا کہ صوبوں کی تفریق اس مقصدِ عظیم کے راستہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے جس کیلئے ہم نے پاکستان کو حاصل کیا ہے۔ کراچی پہنچکر طلوع اسلام کا پہلا پرچہ جنوری ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس پہلے پرچہ میں ہم نے لکھا تھا کہ

ہم پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں میں اس بعد و فصل اور بیگانگی و مغائرت کا رونا رو رہے ہیں جس کا ہمیں مستقبل میں خدشہ نظر آتا ہے۔ لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ خود پاکستان کے مسلمانوں میں صوبائی تعصب اس قدر شدید ہے کہ اس کا احساس ہر قلب دردآگیں کیلئے وجہ ہزار اضطراب ہے۔ (ص ۱۱۲)

مغربی پاکستان کے صوبوں سے ہٹ کر ہم نے اسی پرچہ میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے باہمی تعلق کے متعلق لکھا تھا کہ

حقیقت یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان، اس ملکِ عظیم کے اجزائے لاینفک ہیں جسے فطرت کی ذرہ نوازیوں نے مسلمانانِ ہند کو عطا فرمایا ہے۔ یہ دونوں حصے آزادی کی فضائے بسیط میں بال کشائی کرنے والے شہباز — پاکستان — کے دو بازو، اور مملکت پاکستان کی گاڑی کے دو پہیے ہیں جن میں سے اگر ایک کمزور ہو جائے تو دوسرا از خود بیکار ہو جاتا ہے۔ . . . . . مشرق اور مغرب کے امتیازات اس دورِ جاہلیت کی تخلیق تھے جسے ہم جھٹک کر الگ کر چکے ہیں اس لئے اب ان کی یاد تک بھی ہمارے دلوں میں نہ آنی چاہیئے۔ جو بت حریم کعبہ سے ایک مرتبہ نکال دیئے گئے وہ وہاں دوبارہ باریابی نہیں پا سکتے۔ (ایضاً ص ۱۱۵)

اس کے بعد طلوع اسلام کا کوئی پرچہ اٹھا لیجئے۔ اس میں آپ کو صوبائی امتیازات کی تباہ کاریوں کے خلاف کچھ نہ کچھ ضرور ملیگا کہیں فغانِ زیرلب کی حیثیت سے اور کہیں نالۂ فلک رس کی صورت میں۔ مثلاً جب ۱۹۴۹ء میں حکومت پاکستان نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ملازمتوں میں صوبائی نیابت ہوگی تو اس پر تنقید کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ صوبائی تقسیم کا وہ شجر ملعونہ جسے انگریز کی حکمت فرعونی کا ابلیسی کارنامہ کہا جاتا تھا کس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنے صحنِ گلستاں میں پیوست کر دیا گیا اور اس کی آبیاری کیسے ذمہ دار ہاتھوں سے ہوئی۔ . . . . . یہ تو تھی مشرقی اور مغربی پاکستان کی تقسیم، اب آگے بڑھئے۔ حال ہی میں حکومت کے شائع کردہ ایک منشور میں کہا گیا ہے کہ مغربی پاکستان کے حصہ کی اسامیاں پنجاب، سرحد، سندھ، کراچی، بلوچستان، قبائلی علاقہ میں، الگ الگ تقسیم کی جائیں گی۔ لیجئے یہ وہ تقسیم ہے جو انگریز کے ملعون عہد میں بھی کبھی نہ ہوئی تھی۔ . . . . . صوبوں کی لکیریں محض نظم و نسق کی سہولت کی خاطر کھینچی گئی تھیں نہ کہ ملک کے باشندوں میں تفریق پیدا کرنے کے لئے۔ اگر یہ لکیریں اس قسم کی تفریق کے خطوط بن رہی ہیں تو ان لکیروں کو جس قدر جلد مٹایا جا سکے اتنا ہی اچھا ہے۔ (طلوع اسلام ستمبر ۱۹۴۹ء ص ۳-۵)

پھر ہم نے مارچ ۱۹۵۳ء کے طلوع اسلام میں لکھا تھا کہ

۱) ملت میں تفرقہ انگیزی کا ایک بنیادی سبب صوبوں کا وجود ہے۔ صوبے ہمارے لیڈروں کی ہوسِ اقتدار اور حرص مناصب و مدارج کو بڑھانے کا موجب بن رہے ہیں۔ انگریزوں نے اپنے مفاد یا انتظامی سہولتوں کی غرض سے ملک کو صوبوں میں تقسیم کیا تھا۔ اب یہی تقسیم ملت میں تفرقہ انگیزی کا موجب بن رہی ہے۔ اسی بنا پر طلوعِ اسلام نے یہ تجویز پیش

کی تھی کہ ملک سے صوبوں کا وجود ختم کر دیا جائے۔ (ص۱۱) = (۱)

غرضیکہ طلوع اسلام مسلسل یہ رونا روتا رہا لیکن ہمارے اربابِ حل وعقد صوبائی تفریق کی گرہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کی کوشش میں مصروف رہے اور ان کی ان کوششوں کا خمیازہ ملتِ پاکستانیہ بھگتتی رہی۔

(۲) ارباب حل وعقد کی جن کوششوں کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے ان میں ایک یہ بھی تھی کہ پاکستان کا آئین اس انداز کا بنایا جائے جس میں مختلف صوبوں میں فیڈریشن قائم کی جائے۔ طلوع اسلام نے اس انداز حکومت کی پہلے ہی دن سے مخالفت کی اور اس ضمن میں مختلف دلائل کے بعد لکھا کہ

(۲) = فیڈرل انداز کی حکومت اس غیر اسلامی صوبائی عصبیت کو مضبوط تر بنانے کا ایک مستقل ذریعہ ہے۔ یہ انداز اسلام کے مزاج کے یکسر خلاف ہے۔ ..... پاکستان میں فیڈرل انداز کی حکومت سے صوبائی قومیتیں آہستہ آہستہ متشدد ہو جائیں گی اور اس چھوٹے سے خطۂ زمین میں بھی مسلمانوں کی وحدت قائم نہ ہو سکے گی۔ چہ جائیکہ ساری دنیا کے مسلمانوں میں وحدت قائم ہو جائے جو اسلام کا منشا ہے۔ (قرآنی دستور پاکستان)

اس کے ساتھ ہی ہم نے جنوری ۱۹۵۳ء کے طلوع اسلام میں لکھا تھا کہ

ذرا غور کیجئے کہ اس طرح مملکت کی آئینی مشینری کتنی بھاری ہو گی۔ ہر صوبہ میں الگ الگ پارلیمان۔ الگ الگ وزارتیں پھر مرکز میں پانچ سو بیس ارکان پر مشتمل دو ایوان، ان کے اوپر کا بینہ۔ پھر صوبوں کے گورنر اور مرکز میں امیر مملکت۔ نو زائیدہ مملکت کی نرم و نازک شاخیں ان پھلوں کے بوجھ سے ٹوٹ جائیں گی۔ (ص۳۱) = (۳)

چنانچہ وحدتِ ملت کے مقصد کے پیش نظر ہم نے اپنے مسودۂ آئین میں تجویز کیا تھا کہ مملکت میں وحدانی انداز کی حکومت قائم کی جائے اور انتظامی سہولت کی غرض سے ملک کو مختلف ولایات (کمشنریوں) میں بانٹ دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ انداز حکومت اسی صورت میں قابلِ عمل ہو سکے گا کہ پوری ملت پاکستانیہ کو ایک قوم کے قالب میں ڈھالنے کی عملی کوششیں کی جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر یہ انداز حکومت کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ لیکن چونکہ اربابِ حل وعقد کی طرف سے اس قسم کی کوئی کوشش نہ کی گئی بلکہ (اس کے برعکس) ہر قدم ایسا اٹھایا گیا جس سے قوم مختلف ٹکڑوں میں بٹتی چلی جائے۔ اس لئے ہم نے اکتوبر ۱۹۵۳ء میں مجبور ہو کر یہ لکھا کہ

اب ہمارے خیال میں صورتِ حالات ایسی پیدا ہو چکی ہے کہ وحدانی انداز کی حکومت بھی شاید کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لئے اب ہماری تجویز یہ ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو دو خود مختار وحدتیں تسلیم کر کے ان میں کانفیڈریسی پیدا کر دی جائے جس میں تراضیٔ مابین سے مشترکہ مسائل اکٹھے رکھ لئے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو مٹا کر پورے ملک میں ایک حکومت قائم کی جائے۔ (ص۹)

اس کے بعد ہم مسلسل دہراتے رہے کہ

مغربی پاکستان سے الگ الگ صوبوں کا وجود ختم کر دیا جائے اور تمام علاقہ ایک ہی مرکز کے ماتحت رہے۔ (اپریل ۱۹۵۴ء)

پاکستان کا مستقبل وحدت میں ہے اور وحدت کی یہی عملی شکل ہے کہ مغربی پاکستان کے صوبوں اور ریاستوں کو ختم کر دیا جائے اور اس طرح اس خطہ کو ایک وحدت بنا دیا جائے۔ (ستمبر ۱۹۵۴ء)

(۳) مغربی پاکستان میں صوبوں کی تقسیم پورے پاکستان کی بربادی کا باعث ہے جب تک مغربی پاکستان ایک وحدت نہیں بن جاتا، پاکستان میں استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ ان صوبوں کو مٹایئے اور انتظامی ضرورتوں کیلئے اس قسم کے خطے بنایئے جو موجودہ صوبائی لکیروں سے ہٹے ہوئے ہوں اور جن میں مختلف صوبوں کی مشترکہ آبادیاں آجائیں۔ (نومبر ۱۹۵۴ء)

المختصر، وحی کی روشنی میں حاصل شدہ بصیرت مسلسل سات سال تک اسے دہراتی رہی۔ لیکن "عقل" نے اپنے تجرباتی طریق کو نہ چھوڑا۔ وہ مسلسل ٹھوکریں کھاتی اور مملکت کو کمزور سے کمزور تر کرتی چلی گئی۔ بایں ہمہ غنیمت ہے کہ قبل اس کے کہ پورے کا پورا ملک تباہیوں کے جہنم میں جا گرتا "عقل" نے حقیقت کو پہچان لیا اور ۲۲ نومبر ۱۹۵۴ء کی شام کو محترم وزیر اعظم نے کراچی کے محطۂ نشر الصوت سے یہ اعلان کیا:

(۴) آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے یکم نومبر کے براڈکاسٹ میں صوبائی تعصب کے خطرات کی طرف توجہ دلائی تھی۔ . . . . . مجھے یقین ہے کہ آپ سب صوبائیت کے خطرہ سے آگاہ ہوں گے۔ . . . . . پاکستان میں باہمی تفریق کی ایسی مصنوعی لکیریں کھینچی ہوئی ہیں کہ جن سے ہماری قومی وحدت قائم نہیں رہتی۔ ہمیں بلا استثنا سب کو یقین ہو چکا ہے کہ جب تک ان مصنوعی حدود بندیوں کو نہ توڑا جائیگا صوبائی تعصب کی لعنت دور نہیں ہوگی۔ اب یہ مطالبہ چاروں طرف سے اٹھ رہا ہے کہ صوبائیت کی یہ لعنت جو ملت واحدہ کی حیثیت سے ہمارے وجود ہی کو خطرہ میں ڈال رہی ہے اس کا استیصال ضروری ہے۔ . . . . . پاکستان کی آئیڈیالوجی ایک خدا، ایک رسولؐ اور ایک قرآن، کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اور یہی وہ آئیڈیالوجی ہے جو تمام اہل پاکستان کو ایک ملت بنا سکتی ہے۔

اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ

کچھ عرصہ پہلے میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرے نزدیک بہترین انداز حکومت تو وحدانی انداز تھا۔ لیکن چونکہ تمام پاکستان کو ایک وحدت بنانا ممکن نہیں۔ اس لئے ہمیں کم از کم مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دینا چاہئے۔ مغربی پاکستان کی موجودہ صوبائی تفریق کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں۔ گذشتہ سات سال میں اس مصنوعی تقسیم نے تشتت و انتشار کے سوا اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کیا۔ . . . . . ویسے بھی ہمارے لئے یہ مشکل ہے کہ ہم ایسے انداز کی حکومت کی مسرفانہ عیاشی کو برداشت کر سکیں جس میں چھ یا سات الگ الگ اسمبلیاں، الگ الگ

وزارتیں، الگ الگ سکریٹریٹ اور خدا جانے کیا کیا الگ الگ ساز و سامان ہوں۔ لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ پورے مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دیا جائے۔

اس اعلان کو سن کر ہمارا سر تشکر و امتنان کے ہزار جذبات کو لئے ہوئے بارگہِ ایزدی میں جھک گیا کہ ہماری قیادت کو یہ توفیق نصیب ہو گئی کہ وہ حقیقت کا اس طرح اعتراف کر لے۔ ۲۴ اکتوبر کی طرح ۲۲ نومبر کی یہ شام بھی پاکستان کی تاریخ میں ایک یادگار شام سمجھی جائے گی۔ ۲۴ اکتوبر کی صبح جس میں ملت کے سینہ سے نام نہاد مجلس آئین ساز کا کابوس اترا تھا اور ۲۲ نومبر کی شام جس میں اس لعنت کے استیصال کے لئے ایک عملی قدم اٹھایا گیا جس نے مغربی پاکستان کی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا تھا۔ ہم محترم گورنر جنرل کو ان کی اس تیسری قلندرانہ جست پر درخورِ ہزار تہنیت و تبریک سمجھتے ہیں۔ یاد رہے کہ جب ہم گورنر جنرل کہتے ہیں تو اس میں ان کے وہ تمام رفقاءِ کار شامل ہوتے ہیں جو ایسے نازک وقت میں سفینۂ ملت کو گردابِ بلا سے نکالنے میں ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔

لیکن ہم نے جو کچھ ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کے اعلان کے بعد لکھا تھا اس کا اعادہ اب پھر کرتے ہیں۔ یعنی یہ قدم جو اب اٹھایا گیا ہے، ہر چند بڑا اہم اور قابلِ قدر ہے، لیکن یہ بہرحال ایک تخریبی قدم ہے یعنی اس سے صوبائی تفریق کی لعنت ختم ہو گئی۔ لیکن ملت کی وحدت اسی صورت میں قائم ہو گی جب اس کے بعد تعمیری قدم بھی اٹھایا جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب جو صوبائی تفریق کا سانپ مرا ہے تو اس کی لکیریں بھی باقی نہیں رہنی چاہئیں۔ مفاد پرست گروہ یقیناً اس قسم کے سوالات پیدا کرے گا کہ اس نئی وحدت میں پرانے صوبائی تحفظات ضرور ہونے چاہئیں۔ اگر اس قسم کا کوئی مطالبہ بھی تسلیم کر لیا گیا تو یاد رکھئے، جس مقصد کے لئے یہ قدم اٹھایا گیا ہے وہ کبھی حاصل نہیں ہو سکے گا۔ اس کے بعد ہمیں ہر قدم ایسا اٹھانا چاہئے جس سے اس فتنۂ ماضی کی یاد تک بھی دلوں میں باقی نہ رہے۔ پٹھانی، پنجابی، سندھی، بلوچی، الگ الگ کلچر اور روایات کا خیال عہدِ جاہلیت کے تصورات کا نتیجہ ہیں۔ مسلمان کا ایک ہی کلچر ہوتا ہے اور ایک ہی روایات۔ اسلام اس کا کلچر ہے اور اسلامی روایات ہی اس کی روایات ہیں۔ لہٰذا اس خیال کے مطابق جداگانہ تحفظات کے کسی مطالبہ کو تسلیم نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ جو علاقے پسماندہ ہوں ان کی مدد کر کے انہیں دوسروں کے برابر لے آنا سب سے پہلا فریضہ ہے۔ اسی کا نام قرآن کی زبان میں "احسان" ہے یعنی جہاں کسی کی کسی کمی سے معاشرہ کے تناسب میں فرق آ جائے اس کمی کو پورا کر کے معاشرہ کے حسن کو برقرار کر دیا جائے۔ اس باب میں طلوع اسلام وقتاً فوقتاً اپنے مشورے پیش کرتا رہے گا۔

دوسرا سوال پاکستان کے اندازِ حکومت کا ہے۔ مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دینے سے مشرق اور مغرب کی اس آویزش کا حل نہیں ہو جاتا جسے جسدِ ملت میں ناسور بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ بحالاتِ موجودہ ہمارے نزدیک خوشگوار تعلقات کی بہترین شکل یہی ہے کہ ان دونوں خطوں کو زیادہ سے زیادہ داخلی آزادی دی جائے اور ایک قسم کی کانفیڈریسی سے

دفاع، امور خارجہ، کرنسی، وغیرہ جیسے اہم امور مرکز کی تحویل میں رہیں۔ اور مرکز میں کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہونے دی جائے جس میں ایک خطہ کسی دوسرے خطہ پر تغلب حاصل کرلے۔ ہم اس حقیقت کو پھر دہرائے دیتے ہیں کہ ایک اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو آئین و قانون کے کاموں میں کبھی شریک نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان کے آئین کے معاملہ میں اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سے ہمارے بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں اور تعلقات کے بہتر ہو جانے پر وحدانی انداز کی حکومت کے امکانات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

جیسا کہ ہم ۱۹۴۸ء سے لکھتے چلے آئے ہیں ملت کے انتشار کا موجب صرف صوبوں کا وجود نہیں، قوم میں مختلف پارٹیوں کا وجود بھی ہے۔ چنانچہ جون ۱۹۵۴ء میں جب ہم نے یہ لکھا تھا کہ "مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو ملا کر ملک کو ایک وحدت بنا دیا جائے" تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ

> ملک میں تمام جماعتوں اور پارٹیوں کو قانوناً ممنوع قرار دیدیا جائے۔ لیکن اس کے لئے سب سے پہلے خود مسلم لیگ کو ختم کرنا ہوگا۔

مسلم لیگ یوں تو عملاً ایک مردہ جماعت ہو چکی ہے لیکن اس کی متعفن لاش سے زہریلے جراثیم کے پیدا ہو جانے کا خطرہ ہر وقت موجود ہے۔ اسے دفن کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی ملک کی دوسری پارٹیوں کو بھی۔ قرآن کی رو سے ملت کے اندر پارٹیوں کا وجود شرک ہے، جسے ایک توحید پرست امت کبھی روا نہیں رکھ سکتی۔

اس کے ساتھ ہی سب سے بڑا مسئلہ معاش کا ہے۔ قرآن کی رو سے ایک اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ دار ہو۔ جس مملکت میں ایک فرد بھی کسی بنیادی ضرورتِ زندگی سے محروم رہ جائے وہ اسلامی مملکت نہیں کہلا سکتی۔ لیکن کوئی مملکت ایسے اہم فریضہ سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ ذرائع پیداوار اس کی اپنی تحویل میں نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ذرائع پیداوار پر افراد کی ملکیت کو جائز قرار نہیں دیتا۔ لہٰذا جب تک پاکستان سے جاگیرداری، زمینداری، سرمایہ داری کو ختم نہیں کیا جاتا، قوم کی مرفہ الحالی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے ایک اور ضربِ کلیمی کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے محترم گورنر جنرل یہ کام کر دیں تو یقیناً جریدۂ عالم پر ان کا نام مسیحائے ملت کی حیثیت سے ہمیشہ ثبت رہے گا۔

(۳)

اس مہینے جس بات نے پاکستان کی فضا میں سب سے زیادہ ارتعاش اور تحرک پیدا کیا وہ ہمارے وزیر امور داخلہ محترم جنرل سکندر مرزا صاحب کا یہ بیان تھا کہ مذہب کو سیاست سے الگ رہنا چاہیئے۔ جیسا کہ ہم سابقہ اشاعت میں لکھ چکے ہیں، مجلسِ آئین ساز کے توڑ دینے کا فیصلہ مولویوں کے لئے مرگِ مفاجات سے کم نہ تھا۔ وہ امیدیں لگائے بیٹھے تھے کہ

نیا آئین آئے گا تو اس میں "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کا ادارہ قائم ہوگا اور ہم ان مسندوں پر براجمان ہوں گے۔ گورنر جنرل کے فیصلہ نے اس حسین خواب کے تار و پود بکھیر دیئے۔ وہ اس سے بھرے ہی بیٹھے تھے کہ محترم مرزا صاحب کے اس بیان نے انھیں دل کے پھپھولے پھوڑنے کا ایک اچھا موقعہ بہم پہنچا دیا۔ چنانچہ چاروں طرف سے شور مچا دیا گیا کہ مذہب کبھی سیاست سے الگ نہیں ہو سکتا۔

مذہب اور سیاست کا تعلق کیا ہے، اس کے متعلق ہم اسی اشاعت میں "مذہب اور سیاست" کے عنوان سے الگ مقالہ لکھ چکے ہیں۔ آپ اسے بھی بنظر غائر دیکھئے تاکہ اس باب میں صحیح نکتۂ نگاہ آپ کے سامنے آجائے۔ گذشتہ سال ہمارے وزیر اعظم محترم محمد علی صاحب نے بھی لندن میں یہی بات کہی تھی۔ ہم نے اس پر جولائی ۱۹۵۳ء کے لمعات میں ایک تفصیلی تبصرہ کیا تھا۔ جس کے ضمن میں ہم نے کہا تھا کہ ــــــ "جس قسم کا مذہب ملا پیش کر رہا ہے اس کا نتیجہ ہوگا کہ ملک کا نوجوان طبقہ سرے سے مذہب ہی سے متنفر ہو جائے گا اور وہ یہ کہہ اٹھے گا کہ مذہب ایک نجی مسئلہ ہے جسے سیاست سے کوئی سروکار نہیں" ــــــ اس کے بعد ہم نے ٹرکی کی مثال کو پیش کر کے لکھا تھا کہ

> یہی بعینہ وہ حالات ہیں جن سے مجبور ہو کر وزیر اعظم پاکستان، محترم محمد علی صاحب کو بھی وہی کچھ کہنا پڑا جو کچھ مصطفےٰ کمال نے کہا تھا۔ پاکستان کے ملاؤں میں جماعت اسلامی ماڈرن ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ جس قسم کا مذہب ان ماڈرن ملانوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اسے مملکت کا آئین اور قانون بنانے کے بعد آپ ایک دن کے لئے بھی انسانوں کی صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں؟ ــــــ آپ غور کیجئے کہ اگر اس مذہب کو سامنے رکھکر محترم محمد علی صاحب یہ نہ کہیں کہ حکومت پاکستان ایک ایسے آئین کے حق میں ہے جسے مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہوگا تو اس میں ان کا کیا قصور ہے۔ وہ ایسا کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں اور ہر سمجھدار آدمی کو یہی کہنا چاہئے" ــــــ
>
> (طلوع اسلام جولائی ۱۹۵۳ء ص۶)

یعنی یہ ہمارے مُلّانوں کا پیش کردہ مذہب ہے جو ہمارے اربابِ حل وعقد کو بار بار یہ کہنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ ــــ "اس سہاگ سے رنڈاپا اچھا" ــــ یہ حقیقت اب اس قدر واضح ہو چکی ہے کہ خود ملانوں ہی کے بعض گوشوں سے اس کا اعتراف بھی ہونے لگ گیا ہے۔ دریاباد کے عبدالماجد صاحب ایک کٹر مُلّا ہیں۔ انھوں نے مرزا صاحب کے مذکورہ بالا بیان پر پاکستان کی مذہبی جماعتوں کی طرف سے جو نکتہ چینی ہوئی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنے اخبار "صدق" لکھنؤ میں "آوردۂ تست" کے عنوان سے حسب ذیل شذرہ لکھا ہے:

> جمعیۃ علماء کی تجویز اپنی جگہ بالکل صحیح ہے، اور ممتاز علماء کی طرف سے "سیکولرازم" پر شدید نکتہ چینی بھی بالکل حق بجانب۔ لیکن گذارش صرف اتنی ہے کہ اس قلق انگیز صورتِ حال کی ذمہ داری صرف دانا دشمنوں ہی پر ہے، یا کسی حد تک نادان دوستوں پر بھی؟ ــــ رعایت حدود اور رعایت احوال وظروف کیا اہم واقدم ہونے کے بجائے کوئی دوسرے اور

تیسرے درجہ کی چیزیں ہیں؟ غلو اور تشدد کا سدباب صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب فاروقی فراست و تدبر کے سایہ میں ہو۔ تفقہ فی الدین اور کٹھ ملائیت کے درمیان آسمان و زمین کا فرق ہے اور تجدد زدہ مسٹروں کی کج فہمی یہ ہے کہ وہ کٹھ ملائیت سے بیزار ہو کر معاً اصل دین سے بغاوت پر پہنچ جاتے ہیں۔ (صدق جدید لکھنؤ۔ مورخہ ۱۲ر نومبر ۵۴ء)

ہمارے ملا جس قسم کے مذہب کو اسلام قرار دیتے ہیں اس کی تصریح کراچی کے ایک مُلّا احتشام الحق صاحب کیرانوی نے اپنے بیان میں کی ہے جو فی الواقعہ پڑھنے کے قابل ہے۔ (ہماری نظر سے محترم مرزا صاحب کے بیان کا یہ حصہ نہیں گذرا لیکن احتشام الحق صاحب نے لکھا ہے کہ انھوں نے کہا تھا کہ اسلام کی تاریخ میں کوئی ایسا دور نہیں ملتا جس میں صحیح اسلامی مملکت قائم ہوئی ہو) اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ صاحب فرماتے ہیں کہ

ظہور اسلام کے وقت سے لیکر آج تک اسلام کی تاریخ میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جس میں کسی ایک دوسرے ملک میں ایسی حکومت نہ رہی ہو جو اسلامی آئین یا قرآنی قوانین پر مبنی نہ ہو۔ خلافت راشدہ کے علاوہ بنی امیہ اور بنی عباس کی سلطنتیں، اپنے بہت سے نقائص کے باوجود، قرآنی قوانین ہی پر مبنی تھیں۔ حتیٰ کہ ہندوستان میں بھی صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت رہی ہے جو اسلامی قوانین کے مطابق تھی۔ آج بھی حجاز، افغانستان، سوات اور قلات کی حکومتیں قدیم قرآنی قوانین کے مطابق بڑی کامیابی سے چل رہی ہیں ..... اس قسم کی کھلی ہوئی شہادت کی موجودگی میں اسلامی آئین اور قرآنی قوانین کے خلاف ایسے بے بنیاد اتہامات لگانا شدید افترا ہے۔ (ڈان ۲۰ر نومبر ۵۴ء)

ملاحظہ فرمالیں آپ نے اسلامی آئین اور قرآنی قوانین کی علم بردار حکومتوں کی مثالیں؟ بنو امیہ اور بنو عباس کے سلاطین، مغلیہ سلطنت کے جہانگیر اور اکبر، اودھ کے واجد علی شاہ۔ اور لال قلعہ کے محمد شاہ رنگیلے، افغانستان اور حجاز کے بادشاہ اور ہماری ریاستوں کے نواب، سب اسلامی آئین اور قرآنی قوانین کے "اسوۂ حسنہ" تھے اور ہیں۔[1]

جس مذہب میں واجد علی شاہ لکھنوی جیسے ظل اللہ اور احتشام الحق صاحب کیرانوی جیسے وارث الانبیاء ہوں اس مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کا خیال فی الواقعہ اتنا بڑا جرم ہے جس کے لئے ابلیس کی بارگاہ سے یقیناً قتل کا فتویٰ صادر ہونا چاہیئے۔

ان کے علاوہ مذہب کے دوسرے اجارہ دار اسلامی جماعت والے ہیں جنھیں علامہ اسلم جیراجپوری نے "مذہبی بازی گر" کہا تھا۔ ذرا ان کی قلابازی ملاحظہ فرمایئے۔ مرزا صاحب کے بیان پر ان کے قیم تیغ بے نیام کی طرح چمک کر

---

[1] اس میں احتشام الحق صاحب کیرانوی کا کوئی قصور نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے مولوی صاحبان ازاول تا آخر "کانسٹی ٹیوشن" اور "لاء" میں کوئی فرق نہیں کر سکے۔ یہ حضرات، تعزیرات ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اگر تعزیرات ان کی خود ساختہ شریعت کے مطابق نافذ کر دی جائیں تو جمہوریت، ڈکٹیٹرشپ، ملوکیت، تغلب، ہر طرز حکومت (FORM OF THE GOVERNMENT) اسلامی ہو جاتا ہے۔

(ملاحظہ ہوں کتب فقہ)

باہر آگئے اور فرمایا کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کا خیال وہ الحاد و بے دینی ہے جسے کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن عین اس وقت جب ان کی طرف سے پاکستان میں یہ اعلان ہو رہا تھا۔ ان کی ہندوستان کی شاخ کے امیر یہ بیان دے رہے تھے کہ

ان کی جماعت سماجی اور ثقافتی اصلاحات میں مصروف ہے اور اسے پارٹی بندی اور سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ (صدق لکھنؤ مورخہ ۹ اکتوبر ۱۹۵۴ء)

یعنی پاکستان میں جماعتِ اسلامی کا اسلام یہ ہے کہ ایک مسلمان مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور اسی جماعت کا ہندوستان میں اسلام یہ ہے کہ مذہب کو سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسے کہتے ہیں "مذہبی بازی گری" یہ اسلئے کہ پاکستان میں اس جماعت نے اپنے زعم میں نصب العین یہ رکھا ہوا ہے کہ

یہ پارٹی اسلام کے اصولوں پر ایک نئے اجتماعی نظام اور ایک نئی تہذیب کی تعمیر کا پروگرام لیکر اٹھے اور عامۂ خلائق کے سامنے اپنے پروگرام کو پیش کر کے زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کرے اور بالآخر حکومت کی مشین پر قابض ہو جائے۔ (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۳۷ء)

اب ہم چند الفاظ جنرل سکندر مرزا صاحب کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں۔ مذہب کے متعلق آپ نے جو کچھ کہا وہ اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے ـــــ لیکن، ایک چیز ہے مذہب۔ اور ایک چیز ہے دین ـــــ چونکہ انگریزی میں دین کے لئے الگ لفظ نہیں اس لئے جب (RELIGION) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو وہ مذہب اور دین دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اور اس سے ایک شدید غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ مذہب تو وہ ہے جس کی تصریح احتشام الحق صاحب نے کر دی ہے، لیکن دین اس سے مختلف ہے۔ دین کے معنی ہیں وہ نظام زندگی، وہ سوشیل آرڈر، وہ ضابطۂ حیات جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔ قرآن چند ابدی اصول یا مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) پیش کرتا ہے اور ہر زمانہ کے انسانوں سے کہتا ہے کہ وہ ان مستقل اقدار کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اپنے لئے خود قانون وضع کریں۔ اس کا نام "دین" ہے۔ مذہب اور دین کا یہی وہ فرق ہے جسے ہمارے گورنر جنرل محترم غلام محمد صاحب نے اگست ۱۹۵۲ء میں ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کراچی کو مخاطب کرتے ہوئے ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

اکثر لوگوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم زندگی کے معاملات میں مذہب کو بہت زیادہ دخیل کر رہے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اسلام ایک جامد مذہب کا نام ہے جو ارتقاء انسانیت کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ گزشتہ ایک ہزار سال کے عرصہ میں اسلام نے استبداد کے ہاتھوں بڑا نقصان اٹھایا ہے۔ ہوا یہ کہ ان مستبد

حکمرانوں نے اسلام کو بطور ایک آلۂ کار کے استعمال کیا۔ مفاد پرست گروہ ان کے ساتھ تھا اور مذہبی پیشوا (علماء) ملوکیت اور مفاد پرستی کے منشاء کے مطابق اسلام کی تاویلات کرتے جاتے تھے۔ اور چونکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہی لوگ مذہب کے واحد ٹھیکیدار ہیں اس لئے جو کچھ یہ کہتے ہیں وہی مذہب بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جسے ہر شخص خواہ وہ مولوی ہو یا سرکاری دفتر کا ملازم بلا کسی روک ٹوک کے از خود پڑھ سکتا ہے۔ خدا کا احسان ہے کہ ہمارے ہاں ذات پات کی کوئی تمیز نہیں نہ ہی ہمارے ہاں کوئی پنڈتوں کا گروہ ہے اور نہ ہی اس قسم کا تصور کہ اس گروہ کے باہر باقی لوگ ذہنی طور پر اچھوت ہیں میں اس پلیٹ فارم سے پوری جرأت اور وضاحت کے ساتھ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اسلام زندگی کے ہر شعبہ میں ہمارے اور آپ کے تصور سے کہیں زیادہ مساوات کا حامی ہے۔

اب کرنے کا کام یہ ہے کہ اس ہزار سالہ عرصہ میں اسلام مستبد ملوکیت اور مفاد پرستانہ پیشوائیت کے جس ملبہ کے نیچے دب چکا ہے اسے وہاں سے نکالا جائے۔ جب وہ اسلام سامنے آئے گا تو آپ دیکھیں گے کہ اس کا پیغام کس قدر صاف اور واضح انسانی حریتِ فکر اور تصورِ جمہوریت کے مطابق اور دنیا کے بلند ترین تصورات سے ہم آہنگ ہے۔

لیکن اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہی اسلام صحیح ہے جو آج ہم میں مروج ہے اور جو ہزار سالہ استبداد اور مفاد پرستی کی تخلیق ہے تو میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں اس قسم کی ملوکیت کے استبداد یا پیشوائیت کی خدائی کیلئے کوئی جگہ نہیں۔ ہم حریتِ فکر و نظر کے قائل ہیں اور تمام انسانوں کے لئے زندگی کے ہر شعبہ میں یکساں مواقع بہم پہنچانے کے حامی ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں میں ان بلند اقدار کی روح پھونکیں جنہیں قرآن پیش کرتا ہے اور جن کے بغیر کوئی قیادت، اخلاقی اور روحانی ترقی نہیں کر سکتی۔

(ڈان۔ ۱۹ اگست ۱۹۵۲ء)

ہمیں یقین ہے کہ محترم مرزا صاحب جس چیز کو مذہب سے الگ رکھنے کی تلقین کر رہے ہیں وہ مُلّا ازم ہے نہ کہ وہ دین جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔ اس لئے کہ

"جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"

ہمارا خیال ہے کہ ہمیں انگریزی میں (RELIGION) کا لفظ استعمال ہی نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں غلط اسلام کے لئے "ملا ازم" اور صحیح اسلام کے لئے "دین" کے الفاظ اختیار کر لینے چاہئیں۔ اس سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔

عام بہی خواہانِ طلوع اسلام سے اپیل طلوعِ اسلام کی توسیع اشاعت کیلئے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ آپ حضرات اپنے اوپر یہ لازم کر لیں کہ اپنا پرچہ پڑھنے کے بعد کم از کم ایک صاحب کو مطالعہ کیلئے ضرور دیدیا کریں۔ جو پڑھ لینے کے بعد آپ کو واپس دیدیں۔

ہفتہ وار طلوع اسلام

نومبر ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں ہم نے لکھا تھا کہ زمانہ کے حالات جس تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں، ان کا تقاضا ہے کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کو بھی اسی انداز سے تیز تر کیا جائے۔ ضرورت تو یہ تھی کہ طلوع اسلام روزنامہ کی شکل میں شائع ہوتا ـــــ ایک اردو میں اور ایک انگریزی میں۔ لیکن کوتاہیٔ دامن کی وجہ سے شروع میں یہی تجویز کیا گیا کہ اسے ہفتہ وار کر دیا جائے ـــــ پہلے اردو میں اور جب حالات اجازت دیں تو اس کے ساتھ ہی انگریزی میں۔ اس کے لئے ہم نے ان حضرات سے معاونت کی اپیل کی جو اس باب میں بغیر کسی شرط اور معاوضہ کے ہمارا ہاتھ بٹانا چاہیں۔ یہ امر ہمارے لئے بڑا حوصلہ افزا اور قابل فخر و مباہات ہے کہ ہماری اس اپیل کے جواب میں قرآنی فکر کی برادری کے افراد ملک کے چاروں گوشوں سے ہجوم کر کے آگے بڑھے۔ لیکن ان میں بیشتر حصہ ان کا ہے جو اپنے پاس مخلص آنسوؤں کی متاع اور درد بھری آرزوؤں کے عطیہ کے سوا کچھ نہیں رکھتے۔ ہمارے لئے ان کے یہ آنسو بیش بہا موتی ہیں، اور ان کی یہ آرزوئیں بے بہا متاع۔ ان کا ہمارے ساتھ ہونا ہمارے لئے بڑی تقویت کا موجب ہے۔ ان کے بعد وہ حضرات ہیں جن کی آمدنیاں بہت قلیل ہیں لیکن انھوں نے اس کے باوجود اس مد میں کچھ نہ کچھ ضرور پیش کر دیا ہے ـــــ پانچ پانچ روپے۔ دس دس روپے۔ ان کی یہ پیشکش ہمارے نزدیک بڑی قیمتی ہے۔ کچھ حضرات نے ان سے زیادہ معاونت کی پیش کش کی ہے۔ بہرحال اس دفعہ یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ

طلوع اسلام کو ہفتہ وار

کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم نے اس کے لئے انتظامات شروع کر دیئے ہیں۔ ہم یہی چاہتے ہیں کہ ہفتہ وار طلوع اسلام کا پہلا پرچہ یکم جنوری کو شائع ہو جائے۔ لیکن اگر اس وقت تک انتظامات مکمل نہ ہو سکے (اس لئے کہ ان میں سے بعض امور دوسروں سے متعلق ہیں مثلاً کاغذ کا پرمٹ، ڈیکلریشن، ڈاکخانہ کی اجازت) تو ممکن ہے کہ یہ جنوری کے دوسرے تیسرے یا چوتھے ہفتہ تک شائع ہو سکے۔ بہرحال اگر ہفتہ وار طلوع اسلام یکم جنوری کو شائع ہو گیا تو پھر ماہانہ طلوع اسلام کا موجودہ پرچہ آخری پرچہ ہوگا۔ اس پرچہ کے ساتھ یہ اپنے کراچی کے دورِ جدید کے سات سال پورے کرلے گا۔ لیکن اگر یکم جنوری کو ہفتہ وار پرچہ شائع نہ ہو سکا تو پھر ماہنامہ طلوعِ اسلام کا ایک پرچہ اور بھی شائع ہوگا۔

پرچہ کا سائز اور قیمت ہفتہ وار طلوع اسلام کا سائز موجودہ طلوع اسلام کے سائز سے دوگنا ہوگا اور ابتداءً ہر پرچہ چوبیس صفحات کا ہوگا۔ یعنی موجودہ طلوع اسلام کے اڑتالیس صفحات کے برابر۔ اس حساب سے آپ کو ہر مہینے موجودہ طلوع اسلام کے سائز کے ۱۹۲ صفحات مل جایا کرینگے (موجودہ طلوع اسلام چھیتر ۷۶ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے) لیکن اس کے باوجود اس کے ہر پرچہ کی قیمت صرف چار آنے اور سالانہ چندہ دس روپے ہوگا (موجودہ طلوع اسلام کا سالانہ چندہ چھ روپے اور ہر پرچہ کی قیمت دس آنے ہے)۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قیمت کے لحاظ سے ہفتہ وار طلوع اسلام میں قارئین کو بہت کفایت رہے گی۔ ہفتہ وار طلوع اسلام میں قارئین کو وہ سب کچھ ملے گا جو موجودہ ماہنامہ میں ملتا ہے اور اس کے علاوہ ایسے جدید عنوانات کا اضافہ ہوگا جن کی گنجائش ایک ماہنامہ میں نہیں ہوتی۔ لیکن جو آج بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ معیار کے اعتبار سے ماہوار طلوع اسلام اور ہفتہ وار میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ بعض حضرات کا مشورہ تھا کہ ہفتہ وار کے ساتھ ماہوار طلوع اسلام کو بھی جاری رکھا جائے۔ کیونکہ (ان کا خیال ہے کہ) ہفتہ وار پرچہ ماہوار پرچہ جیسا وقیع اور پروقار نہیں ہوا کرتا۔ ان کے مشورہ کا شکریہ۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ قابلِ عمل نہیں۔ اگر طلوع اسلام ڈراموں، افسانوں، غزلوں، فلمی گیتوں اور معموں پر مشتمل ہوتا تو ہفتہ وار کے ساتھ ماہانہ تو ایک طرف روزنامہ طلوع اسلام بھی شائع ہو جاتا۔ لیکن جو کچھ طلوع اسلام پیش کرتا ہے اس کیلئے ہفتہ وار کے ساتھ ماہانہ کی اشاعت بہت مشکل ہے۔ ہم اس وقت صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ بتوفیق ایزدی ہفتہ وار طلوع اسلام بھی اپنے وقار میں کچھ کمی نہیں آنے دیگا۔

انگریزی اشاعت باقی رہا طلوع اسلام کا انگریزی ایڈیشن سو اس کی ضرورت اور اہمیت سے کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا۔ طلوع اسلام کی قرآنی برادری کی طرف سے ابھی جو اعانات موصول ہو رہے ہیں۔ اگر معاونت اس حد تک وسیع ہو گئی کہ وہ دونوں پرچوں کا بار اٹھا سکے تو اس کا ہفتہ وار انگریزی ایڈیشن بھی بہت جلد شائع کر دیا جائیگا۔

السابقون الاولون سے

ہم نے اپنی اپیل میں کہا تھا کہ یہ معاونت بلا مشروط ہوگی اور جن حضرات نے اس کے جواب میں لبیک کہا ہے انھوں نے نہایت کشادہ دلی سے اس کی تصریح کر دی ہے کہ یہ معاونت غیر مشروط ہے اور ہم اس کے معاوضہ میں کچھ نہیں چاہتے حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات نے اپنے اس مخلص جذبہ سے ایسی متاع گراں بہا خرید لی ہے جس کا معاوضہ دیا ہی نہیں جا سکتا لیکن ہم چاہتے یہ ہیں کہ خدا کے یہ مخلص بندے جنھوں نے محض اس کے قانون کی نشر و اشاعت کیلئے اس طرح لبیک کہا ہے ان سے ہمارا تعلق عمر بھر کا رہے۔ لہٰذا ان حضرات کی خدمت میں طلوع اسلام ان کی پوری زندگی بھر بلا قیمت حاضر ہوتا رہیگا اس میں اسکا کوئی لحاظ نہیں ہوگا کہ کسی نے اس میں پانچ روپے دیئے ہیں یا پچاس روپے۔ ہم ان سے سودا نہیں کر سکتے۔ ہم ان کے جذبہ کی قیمت ہی نہیں دے سکتے۔ ہمارا اور ان کا باہمی رفاقت کا تعلق ہے۔ خدا اس عہد کو استوار رکھے۔

رقوم ارسال فرمادیں

ان حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اپنے اپنے وعدہ کے مطابق ہمیں روپیہ ارسال فرمادیں۔ اس کی بہترین شکل تو بذریعہ منی آرڈر ہے لیکن منی آرڈر پر زائد پیسے صرف آجاتے ہیں۔ اس سے باکفایت شکل یہ ہے کہ یا تو پوسٹل آرڈر بھیجدیا جائے یا بنک کا ڈرافٹ۔ بنک ڈرافٹ کی شکل ہمارے لئے سب سے زیادہ آسان ہوگی۔

بنک ڈرافٹ یا پوسٹل آرڈر "محترم عبدالرب" صاحب کے نام پر ہونا چاہئے۔

پوسٹل آرڈر یا بنک ڈرافٹ بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ بھیجیں اور ہر صورت میں اسکی تصریح کردیجئے کہ یہ ہفتہ واری اسکیم کے سلسلہ میں ہے۔

خریداران سے

اسوقت خریدار حضرات نے ماہانہ طلوع اسلام کا چندہ بھیجا ہوا ہے۔ طے یہ کیا گیا ہے کہ ان کا جسقدر چندہ ہمارے ذمہ بقایا ہے اسے ہفتہ وار طلوع اسلام کے سالانہ چندہ سے منہا کرکے باقی رقم وصول کرلی جائے۔ اس طرح وہ ہفتہ وار طلوع اسلام کے سال بھر کیلئے خریدار ہوجائیں گے۔ ذیل کی مثال سے اس کی وضاحت ہوجائے گی۔

(۱) الف کا سالانہ چندہ جون ۱۹۵۳ء سے شروع ہوا۔

(۲) دسمبر کے پرچہ کے ساتھ اسے سات پرچے مل گئے۔

(۳) چھ روپیہ سالانہ یا آٹھ آنے فی پرچہ کے حساب سے سات پرچوں کی قیمت ساڑھے تین روپے ہوگئی۔

(۴) اس کے چندہ میں سے اڑھائی روپے بقایا رہے۔

(۵) ہفتہ وار طلوع اسلام کا سالانہ چندہ دس روپے ہوگا۔

(۶) الف سے ساڑھے سات روپے مزید وصول کرکے ہفتہ وار طلوع اسلام سال بھر کیلئے جاری کردیا جائیگا۔ ہم ہر ایک خریدار کا الگ الگ حساب مرتب کررہے ہیں۔ دسمبر کی کسی تاریخ کو ان کے پاس ان کے حساب کا کارڈ پہنچ جائیگا۔ اگر وہ مطلوبہ رقم بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں گے تو اس میں انھیں کفایت رہے گی۔ ورنہ ان کی خدمت میں وی پی بھیجدیا جائیگا۔

معاونین (یعنی پیشگی خریداران) سے

جن حضرات کی پیشگی رقوم (یعنی سو روپیہ والی مدمیں) ہمارے پاس جمع ہیں انھیں کچھ لکھنے یا بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ہم ان کا حساب کرکے مطلوبہ رقم ان کے حساب میں درج کردیں گے۔

بزم ہائے طلوعِ اسلام سے

ہفتہ وار طلوع اسلام کی ابتدائی تین چار اشاعتوں کے کچھ نمونے کے پرچے عام نشر و اشاعت کی غرض سے بلاقیمت تقسیم کئے جائینگے۔ ان پرچوں کو

ان لوگوں تک نہایت احتیاط سے دستی پہنچانا ہوگا جن کے متعلق آپ کو خیال ہو کہ وہ قرآنی فکر سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ آپ اپنے ہاں کا اچھی طرح جائزہ لے لیں اور پھر ہمیں اطلاع دیں کہ آپ زیادہ سے زیادہ کتنے پرچے اس انداز سے تقسیم کر سکیں گے۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ ان میں سے ایک پرچہ بھی ضائع نہیں ہونا چاہیئے۔

ایجنسیوں سے

آپ اسوقت ماہوار طلوع اسلام منگا رہے ہیں۔ اب آپ اس کا اچھی طرح جائزہ لیلیں کہ ہفتہ وار طلوع اسلام آپ کو کتنی تعداد میں درکار ہوگا اسکی قیمت ۳ر ہوگی اور کمیشن کا حساب وہی ہوگا جو اب ہے۔ اس کی اطلاع ہمیں ۱۵ دسمبر تک پہنچ جانی چاہیئے۔

عام بہی خواہانِ طلوعِ اسلام سے

طلوع اسلام کسی سرمایہ دار کا پرچہ نہیں کسی پارٹی کا پرچہ نہیں۔ نہ ہی یہ فلمی رسالہ ہے اور نہ ہی اس میں معموں کا کاروبار ہوتا ہے محض خریداری کی آمدنی سے ایسے پرچوں کا خرچ کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اس کے خسارہ میں کمی کی یہی صورت ہو کہ اسے اشتہارات مل جائیں۔ بجز مشکل یہ ہے کہ فحش کاری کے اشتہارات بھی اس میں شائع نہیں ہو سکتے ورنہ ان کی کچھ کمی نہیں ہے۔ آپ ہماری معاونت اس صورت میں کر سکتے ہیں کہ آپ اپنے حلقۂ تعارف میں دیکھیں کہ جو لوگ اپنے کاروباری سلسلہ میں اشتہارات دیتے ہوں انھیں اس پر آمادہ کریں کہ وہ ہفتہ وار طلوع اسلام میں اشتہار دیں۔ انھیں بتا دیں کہ اسوقت طلوع اسلام کے پڑھنے والوں کا حلقہ اس قدر وسیع ہے جو سنجیدہ انداز کے کسی اور ماہوار پرچہ کو حاصل نہیں ہے اور ہفتہ وار طلوع اسلام کا یہ حلقہ اور بھی وسیع ہو جائیگا۔ اگر آپ اس سلسلہ میں کچھ جدوجہد کرنا چاہیں تو ہمیں اطلاع دیں تاکہ ہم آپ کو نرخ نامہ اشتہارات اور ضروری ہدایات بھیج سکیں۔ اس خدمت کیلئے قاعدہ کے مطابق کمیشن بھی دیا جائیگا۔

اپنے اللہ سے

آخر میں ہم اپنے نشوونما دینے والے سے اس توفیق کے طلبگار ہیں کہ جن احباب نے اس باب میں ہم پر اعتماد کیا ہے ہم ان کے اعتماد پر پورے اتریں، ان کی امانتوں میں سچے امین ثابت ہوں اور تیرے قانون کی نشر و اشاعت اور تیرے نظام کی تشکیل و استحکام میں ہمارا جو قدم آگے بڑھے وہ پیچھے نہ ہٹے اور ہم ایک بار اس فردوس نگاہ نظارہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں جس کے متعلق تو نے کہا ہے کہ

"زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی"

اور جنت سے نکلا ہوا آدم ایک بار پھر جنت میں داخل ہو جائیگا۔ وہ جنت جو اس نے تیرے پروگرام پر عمل کرنے سے حاصل کی ہوگی۔

علیک توکلت والیک انیب

ناظم ادارۂ طلوع اسلام
پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی

ہمارا اور آپ کا مشترکہ مفاد

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے طلوع اسلام نے آجتک نہ کسی سے مالی مدد مانگی ہے، نہ اب مانگ رہا ہے۔ البتہ اس کی ایک اسکیم ہے جس کی رو سے آپ اسے ایک پیسہ بھی مفت نہیں دیتے لیکن اسے قرآنی لٹریچر کی اشاعت میں سہولت بہت ہو جاتی ہے۔ اسکیم یہ ہے کہ اگر آپ ایک سو روپیہ (یکمشت یا چار مساوی ماہانہ قسطوں میں) ادا کر دیں تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس حساب میں ہم آپ کو رسالہ طلوع اسلام اور اس کی شائع کردہ کتابوں میں سے جو بھی آپ کو مطلوب ہوں بھیجتے چلے جائیں گے تا آنکہ آپ کا ایک سو روپیہ پورا ہو جائے۔ اس کے بعد آپ پھر اسی طرح پیشگی روپیہ جمع کرا سکتے ہیں۔ اگر ہم کسی وجہ سے اس سلسلہ کو جاری نہ رکھ سکیں تو آپ کا بقایا روپیہ آپ کو واپس کر دیا جائے گا۔

یہ اسکیم قریب ایک سال سے جاری ہے اور اس عرصہ میں ہم ایک درجن سے زائد کتابیں شائع کر چکے ہیں ——— ماہ جولائی ۱۹۵۴ء تک پیشگی خریداران کی تعداد ۲۳۵ تک پہنچ گئی تھی مگر اب اس کی رفتار بہت ہی سست پڑ گئی ہے اس کی طرف ناظرین کو خاص طور پر متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ ایک درجن کے قریب کتابیں شائع ہونے کے لئے رکھی ہوئی ہیں جن میں "قرآنی نظام ربوبیت" اور معارف القرآن کی سابقہ جلدیں جو اب نایاب ہیں، نیز معارف القرآن کی پانچویں جلد جیسی ضخیم کتابیں بھی شامل ہیں۔ آپ خود ہی غور فرمائیے کہ اس سلسلہ میں آپ کا کیا فرض ہے۔

ایک خصوصی رعایت

اس سلسلہ کو آگے بڑھانے اور ناظرین کی اس میں دلچسپی بڑھانے کے لئے یہ طے کیا گیا ہے کہ آئندہ سے پیشگی خریداران کے لئے ان کی مطلوبہ کتابوں پر محصول ڈاک بذمہ ادارہ ہوگا یعنی ان کی تمام مطلوبہ کتابیں اصل قیمت پر بلا ادائیگی محصول ڈاک اپنے گھر پر مل جایا کریں گی۔

اگر آپ ابھی تک "پیشگی خریداران" کی اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اس پر غور فرما لیجئے کہ اس اسکیم کی رو سے آپ ایک پیسہ بھی زائد نہیں دیں گے اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں ہمیں بہت آسانی ہو جائے گی۔ بات صرف اتنی ہے کہ آپ قیمت پیشگی دیتے ہیں۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳، کراچی

سلیم کے نام

(تصوف)

سلیم میاں! میں مسلسل تین ماہ تک کوشش کرتا رہا کہ تم اپنے اس سوال کے جواب کیلئے اصرار نہ کرو لیکن میں جسقدر انکار کرتا رہا اسی قدر تمہارا اصرار بڑھتا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ تم پہلے اسلام (یعنی مسلمانوں) کی تاریخ کا بالاستیعاب مطالعہ کرلو اور پھر ان مسائل کے پیچھے نکلو۔ اس وقت یہ باتیں تمہاری سمجھ میں زیادہ آسانی سے آسکتی تھیں۔ مگر تمہاری ضد کا کیا علاج! لیکن اس میں بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ زیادہ قصور خود میرا ہی ہے۔ اس لئے میں ہارا۔ تم جیتے۔ لو اب غور سے سنو۔

تمہارے سوال کا جواب تو میں ایک فقرے میں دے سکتا تھا اور وہ بھی اپنے الفاظ میں نہیں بلکہ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں جو انھوں نے ۱۹۱۷ء میں سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام اپنے ایک خط میں لکھے تھے کہ

> اس میں ذرا شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے

لیکن اس سے تمہارا اطمینان نہیں ہوگا اس لئے ذرا تفصیل سے لکھتا ہوں۔

اگرچہ تصوف (Mysticism) قریب قریب دنیا کی ہر قوم میں موجود ہے اور آج سے نہیں بلکہ تاریخ کے اولیں اوراق سے اس کا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود (مذہب یعنی (Religion) کی طرح) اس کی بھی کوئی جامع اور مانع تعریف (Precise definition) آجتک نہیں ہو سکی۔ اس کا دائرہ بہت سے تجارب و کیفیات، احوال و مقامات اور شعائر و مناسک کو محیط ہے لیکن ان میں دو بنیادی عناصر ایسے ہیں جو تصوف کی اصل سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی (۱) انسان کا خدا کے ساتھ براہِ راست مکالمہ اور (۲) نفسِ انسان کا حقیقتِ مطلقہ (یعنی خدا) کے ساتھ مل جانا جسے وصال یا فنا کہتے ہیں۔ یہ تمام کیفیات ہر فرد کی ذاتی (یعنی انفرادی) ہوتی ہیں جن میں کوئی دوسرا فرد شریک نہیں ہوتا۔ نہ وہ فرد ان کیفیات کو کسی دوسرے کو محسوس کرا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے تصوف بحیثیت ایک مذہب کے ایکسر شخصی یا ذاتی (Personal religion) ہوتا ہے اور یہ تجارب (Experiences) اس کائنات کے حسی یا مشاہداتی علم کے بغیر، ایک ایسے ذریعہ سے حاصل ہوتے ہیں جو بالکل نگاہوں سے مستور اور حواس سے پوشیدہ رہتا ہے۔ اسی کو باطنی ذریعۂ علم کہتے ہیں۔ اس علم کے حصول کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ نفسِ انسانی جب باطن کی گہرائیوں میں چلا جاتا ہے تو وہاں یہ اس حقیقتِ کلی میں جذب ہو جاتا ہے جو کائنات کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے اور اس طرح نفسِ انسان اور حقیقت (Reality) ایک ہو جاتے ہیں اور وہ بغیر کسی ذریعہ یا واسطہ کے تمام حقائق کا براہِ راست مشاہدہ کر لیتا ہے۔ مشاہدہ کیا، وہ خود ہی حقیقت بن چکا ہوتا ہے۔ چونکہ حقیقتِ مطلقہ تمام مادی اور محسوس نسبتوں سے بلند اور منزہ ہے اسلئے نفسِ انسانی اس کے ساتھ اسی صورت میں پیوست (بلکہ اس کے

اندر ضم) ہو سکتا ہے جب یہ خود تمام محسوس اور مادی علائق سے بلند اور پاک ہو جائے۔ اس کیلئے نہ صرف دنیوی حظائظ ولذات سے ترکِ تعلق ضروری ہے بلکہ اپنے قلب و دماغ کو بھی اس مقام پر لے جانا ہوتا ہے جہاں اس محسوس دنیا کے نقوش اور خیالات کا کوئی گذر نہ ہو۔ یعنی مادی دنیا کی آلائش تو ایک طرف، محسوس اشیاء کے تصورات اور خیالات تک بھی دماغ میں نہ آنے پائیں۔ تصوف کی اصطلاح میں اس کیفیت کو "مکمل تاریکی" (Complete darkness) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ دنیائے محسوسات سے اسقدر دور چلے جاتے ہیں کہ ان کے عقیدہ کی رو سے وحی کے الفاظ بھی محسوسات میں داخل سمجھے جاتے ہیں اس لئے وہ انھیں چھوڑ کر وحی کا صحیح مفہوم اس باطنی دنیا سے متعین کرتے ہیں جس کا علم انھیں براہ راست حاصل ہوتا ہے۔ اسے وہ حقیقت کا باطنی علم یا خود "حقیقت" کہتے ہیں۔ چونکہ وہ اس طریق سے حاصل کردہ علم کو بلاواسطہ علم (Direct knowledge) کہتے ہیں اس لئے وہ اسے یکسر حتمی اور یقینی قرار دیتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں محسوسات کے ذریعہ سے حاصل کردہ علم کو ظنی اور غیر یقینی ٹھہراتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ اپنے علم کو دیگر تمام علوم کے مقابلہ میں افضل اور اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ یہ مقام انھیں مختلف جانکاہ مشقتوں اور جگر سوز ریاضتوں سے حاصل ہوتا ہے جن میں بعض اوقات جان تک کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔

یہ ہیں سلیم! مختصر الفاظ میں تصوف کے مبادیات اور لزوم و خصائص۔

ظہورِ اسلام کے وقت دنیا میں چار بڑے بڑے مذاہب تھے یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور بدھ مت۔ آخر الذکر دونوں مذاہب (مجوسیت اور بدھ مت) میں وحی کا کوئی امتیازی اور خصوصی تصور نہیں تھا اس لئے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے ہاں ایک نبی کی وحی اور ارباب تصوف کے کشف و الہام میں فرق کیا جاتا تھا یا نہیں۔ لیکن یہودیت اور نصرانیت میں یہ ضرور تھا۔ اگرچہ بہت مبہم طریق پر تھا۔ یہودی گو حضرت موسیٰ کو جس انداز کا نبی مانتے تھے، اس انداز کا نبی یرمیاہ، دانیال، یسعیاہ، حزقیل، وغیرہ کو نہیں مانتے تھے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ انھیں بھی نبی (Prophets) ہی کہتے تھے۔ اس لئے کہ ان کے ہاں نبی کے معنی ہی تھے پیش گوئیاں کرنے والا۔ (اسی لئے اس کا ترجمہ Prophet کیا جاتا ہے) اس لئے بادی النظر میں یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان کے ہاں ایک رسول کی وحی اور ایک ولی کے الہام میں فرق کیا جاتا تھا یا نہیں۔ عیسائی اپنی انجیل کے مرتبین (لوقا، مرقس وغیرہ) کو سینٹ (ولی) کہتے ہیں اور انھیں حضرت عیسیٰ ؑ کا ہم مرتبہ نہیں مانتے۔ (یہ غالباً اس لئے کہ ان کے نزدیک حضرت عیسیٰ ؑ کا مقام خدائی مقام ہے جس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا)۔ ان کے بعد بھی ان کے ہاں اولیاء (Saints) ہی کا سلسلہ چلتا ہے۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ عیسائیوں کے ہاں رسول کی وحی اور اولیاء کے کشف و الہام میں فرق ہے۔ لیکن (جیسا کہ میں ذرا آگے چل کر بتاؤں گا) وحی اور الہام کا فرق (خواہ وہ عیسائیوں کے ہاں ہو یا مسلمانوں کے ہاں) صرف اصطلاحی فرق ہے۔ نوعیت دونوں کی ایک ہی ہے مسلمانوں کو یہ فرق زیادہ شدت سے کیوں کرنا پڑا، اس کے متعلق بھی بعد میں لکھا جائے گا۔

یہودیت ظواہر پرستی کا مذہب ہے اس لئے اس میں باطنیت کی گنجائش بہت کم تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی پہلی تباہی کے بعد بابل کی اسیری کے زمانہ میں، جب کہ قوم اپنے ضعف و انحطاط کی انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ (اور یہی زمانہ تصوف کے ابھرنے کا ہوتا ہے) ان میں بھی کچھ کچھ باطنیت کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے۔ چنانچہ اس دور میں، ان کے "نبیوں"

(Prophets) کے احوال وظروف کچھ اس قسم کے ہیں جیسے باطنی خلوت گاہوں میں اربابِ تصوف کے ہوتے ہیں۔ اُسی قسم کا اسلوبِ زندگی، وہی اندازِ گفتگو۔ اسی طرح کے مکاشفات اور الہامات۔ اُسی نوع کی پیشگوئیاں۔ لیکن حقیقی تصوف ان میں اس کے بعد جا کر آیا ہے، جب ان کے مذہبی پیشواؤں نے اسکندریہ میں یونانی فلسفہ کا مطالعہ کیا اور وہاں اس فلسفہ اور اپنے معتقدات کے امتزاج سے ایک نیا مذہب ایجاد کیا۔ فیلو (Philo) اس مذہب کا امام ہے۔ تصوف کا ابوالآباء، درحقیقت افلاطون (Plato) کو سمجھنا چاہیئے۔ اس نے سب سے پہلے یہ تصور پیش کیا تھا کہ اس عالمِ محسوس کے اوپر ایک عالمِ امثال ہے۔ وہ عالم حقیقی وجود رکھتا ہے اور یہ عالم اس کا محض پرتو ہے۔ اس عالم میں جو کچھ ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اس کی حقیقت سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس حقیقی عالم کے متعلق علم، حواس کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا۔ باطنی طریق سے حاصل ہو سکتا ہے۔ افلاطون کے اس فلسفہ (یا بالفاظِ صحیح، تصوف) کی نشاۃِ ثانیہ بعد کے فلاسفروں کی ایک جماعت کے ہاتھوں ہوئی جن کا امام فلاطینس (Plotinus) تھا۔ ان فلاسفرز میں سے ایک (Apollonious of Tyana) نے ہندوستان کا سفر کیا اور وہاں کے براہمنوں سے ہندی تصوف سیکھا۔ فلاطینس، رومی لشکر کے ساتھ ایران گیا اور وہاں کے مُغوں سے مجوسی تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ان فلاسفروں نے فلاطینس کی زیرِ سرکردگی افلاطون کے فلسفہ قدیم کو، ان ہندی اور ایرانی تصورات کے ساتھ ملا کر ایک جدید قالب میں ڈھالا۔ اس کا نام نوفلاطونی فلسفہ یا (Neo-Platonism) ہے۔ اس فلسفہ کا مرکز اسکندریہ تھا اور یہیں اس سے فیلو کا یہودی تصوف متاثر ہوا۔ اس تصوف کا سب سے پہلا اثر یہ تھا کہ تورات کی شریعت معرفت اور حقیقت میں بدل گئی۔ چنانچہ یہودی تصوف کی سب سے اہم کتاب زہار میں ہے کہ

> تورات کی روح درحقیقت اس کے باطنی معنوں میں پوشیدہ ہے۔ انسان ہر مقام پر خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ تورات کے ان باطنی معانی کا راز پا جائے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے لگ جائے۔

تورات کی شریعت، ہر بنی اسرائیل کے لیے کھلی تھی لیکن تورات کے باطنی معانی صرف خواص تک محدود ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ مشناہ (کتابِ "حقیقت") میں لکھا ہے کہ

> کتابِ پیدائش کے باطنی معانی کی تعلیم ایک وقت میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو نہیں دی جانی چاہیئے۔ اس کی سخت ممانعت ہے۔ اور کتابِ حزقیل کے پہلے باب کی تعلیم تو ایک آدمی کو بھی نہیں دینی چاہیئے تاوقتیکہ اس نے مقامِ ولایت حاصل نہ کر لیا ہو۔

ان کا عقیدہ یہ تھا کہ تورات کے اصل معانی اس کے الفاظ سے نہیں مل سکتے۔ ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کا ایک اور طریقہ ہے جو عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ وہ کہتے تھے کہ عبرانی زبان کے حروفِ ابجد میں عجیب و غریب تاثیر ہے اور انہیں خاص خاص طریقوں سے اکٹھے کرنے اور دہرانے سے تورات کے الفاظ کے باطنی معانی معلوم ہو جاتے ہیں۔ نیز ایک سے دس تک کے عدد بھی بڑی خواص تاثیرات رکھتے ہیں۔ ان حروف اور اعداد کے متعلق کتاب زہار میں ہے کہ

خدا نے ان کے نقوش تیار کئے، پھر ان کے سانچے بنائے۔ ان کا وزن کیا۔ ان میں ادل بدل کیا۔ انھیں ایک دوسرے کے ساتھ ملایا۔ اور ان کے پراسرار مجموعوں سے کائنات کی ہر شے کی روح پیدا کی۔ چنانچہ کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ بھی انہی کی قوت کے سہارے قائم ہے اور جو کچھ پیدا ہوگا وہ بھی انہی کے ذریعے پیدا ہوگا۔

ان حروف اور اعداد کا باطنی علم، علم حقیقی ہے اور اس سے انسان پر اسرار و رموز کائنات اور تورات کے حقیقی مفہوم کی راہیں کھلتی ہیں جس پر یہ راہیں کھلتی ہیں اس سے عجیب و غریب کرامات صادر ہونے لگ جاتی ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں ان کے "ربانی صوفیوں" (Rabbinic Mysticism) کی شعبدہ بازیوں کے عجیب عجیب قصے مشہور ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ سبت کی شام کو رموز کائنات کے حل کرنے میں مصروف ہوئے۔ بھوک لگتی تو ایک تین سالہ بچھڑا نمودار ہوجاتا جسے وہ کھا جاتے۔ وقس علی ہذا۔ ان کے یہ ارباب تصوف اپنے ہاں کی الہامی کتابوں کی تاویلات اپنے ذاتی مکاشفات سے کرتے اور خوابوں کی تعبیر سے زندگی کے مسائل کا حل بتلاتے اور آنے والے واقعات کی خبریں دیتے۔ جب عیسائیت کا ظہور ہوا تو یہ تصوف یہودیوں میں عام تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم (خدا کے ہر سچے نبی کی تعلیم کی طرح) ان خرافات کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہودی پیشوائیت ان کی جان تک کی دشمن ہوگئی۔ لیکن ان کی تشریف برادری کے بعد خود عیسائیت ہی کچھ بن کر رہ گئی۔ ایک تو اس لئے کہ جو لوگ عیسائی ہوتے تھے وہ پہلے یہودی ہی تھے اور دوسرے اسلئے کہ عیسائیت اپنے ابتدائی دور ہی میں سخت نامساعد حالات کا شکار ہوگئی اس لئے اسے بہت جلد، مجاہدانہ سعی و عمل کو چھوڑ کر تصوف کی قرارگاہ میں پناہ لینی پڑی۔ بہرحال اب ہم عیسائیت کے تصوف کی طرف آتے ہیں۔

سلیم! غور سے سن رہے ہو یا موضوع کو خشک سمجھ کر جمائیاں لینے لگ گئے ہو؟ لیکن موضوع خشک ہے یا تر۔ اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست! اس لئے خود کردہ را علاجے نیست۔ اب تو آخر تک بات سننی ہی پڑے گی۔

عیسائیت میں پہنچ کر تصوف نے ایک منظم مسلک (Organised system) کی شکل اختیار کرلی۔ اب باقاعدہ خانقاہیں قائم ہوگئیں۔ ان کے قواعد و ضوابط وضع ہوئے۔ ان میں داخلہ کی شرائط مقرر ہوئیں۔ ان کے اندر زندگی بسر کرنے کے طور طریق متعین ہوئے جن پر نہایت سختی سے پابندی لازمی ٹھہرائی گئی۔ اس روحانی ترقی کے لئے مختلف قسم کی ریاضتوں اور مشقتوں کے زینے تجویز ہوئے۔ رفتہ رفتہ مختلف اولیاء (Saints) نے اپنے حلقے اور مرکز قائم کئے اور اس طرح پورا مذہب تصوف کی آماجگاہ بن گیا۔ اب ہر مقام پر اس قسم کے الفاظ دہرائے جانے لگے کہ

> اگر تم حواس کے دروازے بند کرکے دل کی آنکھیں کھولو۔ اگر تم جسمانی لذائذ سے منہ موڑ کر روحانی کیفیات کا پیچھا کرو تو تم خدا کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لوگے۔ جب آدم اور حوا کی جسمانی آنکھیں کھلی ہیں تو ان کی روحانی آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔ لیکن اس کے بعد یسوع مسیح آیا تاکہ جن کی آنکھیں بند ہیں وہ دیکھنے لگ جائیں اور جو دیکھ رہے ہیں ان کی آنکھیں بند ہوجائیں۔ پس یاد رکھو! حواس کی آنکھیں بند اور دل کی آنکھیں کھولنے ہی سے خدا اور

اس کا اکلوتا بیٹا بے نقاب ہو کر سامنے آسکے گا۔ (St. Origen)

اس مقصد کے لئے ترکِ دنیا۔ ترکِ علائق۔ ترکِ خیالات۔ ترکِ آرزو، غرضیکہ "روحانیت" کے لئے علاوہ ہر شے کا ترک ضروری قرار پاگیا اور حقیقی زندگی اسے سمجھا گیا جس میں انسان ہر وقت ـــ گوش بند و چشم بند و لب بہ بند ـــ کی حالت میں مراقبہ میں بیٹھا، رموز و اسرارِ کائنات کے جلوے دیکھتا رہے۔

وہ عالم غیب۔ وہ دنیائے نور۔ وہ بلند سے بلند تر مقام جہاں سادہ، غیر متبدل اور مطلق حقیقتیں، باطنیت کی مصمر خاموشیوں کی نورانی قباؤں میں لپٹی ہوئی ہیں۔ ان کے جلوے دیدۂ ظاہر بیں سے نہیں دیکھے جاسکتے۔ انھیں دیکھنا چاہتے ہو تو اپنے حواس کو بھی پیچھے چھوڑ دو اور عقل و خرد اور شعور و ادراک کو بھی۔ یعنی ہر اس چیز کو جو عقل و حواس کے ذریعے سمجھ میں آسکتی ہے خواہ وہ موجود ہے یا غیر موجود۔ سب کو چھوڑ دو اور اپنے آپ کو اس میں جذب کرنے کی کوشش کرو جو ان تمام حدود و قیود سے ماورا ہے۔ یاد رکھو! اگر تم میں ان ہستیوں میں سے کوئی نسبت بھی باقی رہی جن سے وہ ماورا ہے تو تم اس تک نہیں پہنچ سکو گے اس کے نور کی شعاع کامل تاریکی میں نظر آیا کرتی ہے۔ کامل تاریکی میں۔ (Dionysius)۔

اس کے لئے

ترکِ دنیا۔ مرشد کی اطاعت۔ خاموشی اور انکساری اولین شرائط ہیں۔ (St. Benedict)

ان طریقوں سے ایک تارک الدنیا ناپد کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

اسے ایک نور کی چادر اڑھا دی جاتی ہے۔ اس کے دل سے روشنی کی کرن پھوٹتی ہے جو اور زیادہ گہری اور تیز روشنی کی طرف اس کی راہ نمائی کرتی ہے تا آنکہ وہ دریائے نور میں غرق ہو جاتا ہے۔ اب اسے اپنے آپ پر بھی کوئی اختیار نہیں رہتا۔ وہ دنیاداروں کی نگاہوں میں پاگل اور وحشی سا نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ تکمیلِ نفس کی منزلیں طے کر رہا ہوتا ہے اور تمام اسرار و رموز کے پردے اس کی آنکھوں سے اٹھتے جاتے ہیں۔ اور آخر الامر وہ خود حقیقتِ مطلق میں جذب ہو جاتا ہے۔ (St. Macarius)

خدا اور انسانی روح کے اس تعلق کو (Origen) "عروسی تعلق" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے دوسرے ولی (Saints) بھی اسے "آسمانی دلہن" (Heavenly Spouse) کہکر پکارتے ہیں۔ (اس اصطلاح کو ذرا اچھی طرح ذہن نشین کر لینا سلیم! اس لئے کہ یہی وہ تصور ہے جو آپ کے ہاں "عرس" کے رنگ میں رائج اور فقیری "دلہنوں" کی صورت میں جلوہ بار ہے!)۔ چونکہ اس طرح زہد و انزوا کی زندگی بسر کرنے والے، لوگوں کی نگاہوں میں بیحد مقبول اور واجب التعظیم قرار پاتے تھے اس لئے رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ لوگ فوج در فوج اس مسلک کی طرف بڑھنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ چوتھی صدی عیسوی میں حالت یہ ہو گئی تھی کہ بستیاں خالی ہو رہی تھیں اور خانقاہیں آباد۔ شام اور فلسطین کے علاقے خاص طور پر اس مشربِ خانقاہیت کے مراکز تھے۔

یہ تھے اس وقت کے حالات جب اسلام کا ظہور ہوا۔ میں نے سلیم! قصداً ایران اور ہندوستان کے تصوف کا تذکرہ اس

مقام پر نہیں چھیڑا۔ اس لئے کہ اس وقت عرب اور اس کے گرد و پیش یہودی اور نصرانی ہی پھیلے ہوئے تھے۔ ہند و ایران کے ساتھ ان کے روابط و علائق براہ راست نہیں تھے۔ یوں بھی یہودی اور نصرانی تصوف ایران کے مجوسی (مانوی) تصوف اور ہندوستان کے بودھی تصورِ فنا اور وحدتِ وجود کو اپنے آغوش میں لے چکے تھے۔

اب ہم اسلام کی طرف آتے ہیں، اس لئے اب جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس کے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھو تاکہ تمہاری یہ الجھن ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے اور اس کانٹے کی چبھن تمہیں پھر نہ ستائے۔ یہودیت یا نصرانیت کے مقابلہ میں، اسلام کے متعلق صحیح بات تک پہنچنے میں بڑی آسانی ہے۔ اس لئے کہ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰؑ نے اپنے پیغام کو لوگوں کے سامنے کن الفاظ میں پیش کیا تھا لیکن رسول اللہؐ نے اپنے پیغام کو جن الفاظ میں دنیا تک پہنچایا تھا اس کا ایک ایک حرف قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ لہٰذا ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ زیرِ نظر موضوع کے متعلق قرآن کی تعلیم کیا ہے۔

قرآن نے سلیم! یہ کہا ہے کہ اللہ نے انسان کو عقل و فکر دی ہے، اور اسے بار بار تاکید کی ہے کہ وہ کائنات کے نظام پر غور کرے ان قوانین کا علم حاصل کرے جن کی رو سے یہ اتنا عظیم الشان اور محیر العقول کارخانہ اس حسن و نظم سے چل رہا ہے۔ اس طرح وہ کائناتی قوتوں کا راز پا لیگا جو اس کے لئے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دی گئی ہیں اور جب ان کا راز پا لے گا (یعنی یہ معلوم کر لیگا کہ وہ کس طرح کام کرتی ہیں اور کیا کیا کام کرتی ہیں) تو ان سے بے شمار فوائد حاصل کر سکے گا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اشیائے کائنات سے جو مفاد حاصل ہوتے ہیں انھیں کس طرح صحیح مصرف میں لایا جائے، یہ وہ سوال ہے جسے تنہا انسانی عقل حل نہیں کر سکتی۔ ان کا استعمال ان مستقل اقدار کے مطابق کرنا ہوگا جنھیں اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے لئے متعین کیا ہے۔ ان کا علم اسے وحی کے ذریعے مل سکے گا۔ وحی کو انسان اپنی محنت اور کسب و ہنر سے حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی ہے۔ یعنی انسان از خود انکشافِ حقیقت نہیں کر سکتا۔ حقیقت اپنے آپ کو خود انسان پر منکشف (Reveal) کرتی ہے۔

لیکن یہ انکشافِ حقیقت (وحی) ہر انسان پر نہیں ہوتا۔ یہ انکشاف خاص خاص انسانوں پر ہوتا ہے جنھیں نبی یا رسول کہا جاتا ہے وہ انسان اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتے ہیں۔ رسول اللہؐ وہ آخری انسان تھے جن کو خدا کی طرف سے وحی ملی۔ یہ وحی قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ بات کیا ہوئی؟ بات یہ ہوئی کہ رسول اللہؐ کے بعد انسانوں کے پاس علم کے ذرائع صرف دو ہی رہ گئے۔

(۱) خدا کی وہ رہنمائی جو قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ اور

(۲) انسانی عقل۔

ان کے علاوہ کوئی تیسرا ذریعۂ علم نہیں جس کا ذکر قرآن میں ہو۔ اس میں کشف، الہام، باطنیت، اندرونی روشنی وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں۔ اس میں صوفی یا تصوف کا لفظ تک نہیں آیا۔ اس میں اولیاء کے کسی گروہ کا الگ تذکرہ نہیں۔ وہ جماعتِ مومنین ہی کو اولیاء اللہ کہہ کر پکارتا ہے۔ اس میں انسانی روح کے خدا کے اندر جذب ہو جانے کا کوئی ذکر نہیں۔ اس میں فانی فی اللہ اور باقی باللہ کی اصطلاحات کا کوئی گذر نہیں۔ اس میں واصل بالحق ہونے یا "عروسی" درجہ حاصل ہونے کا اشارہ تک نہیں۔ باقی رہا قرآن۔ سو اس کے متعلق اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ عربی زبان کی ایک کتاب ہے۔ اس کی زبان بڑی صاف، واضح اور روشن ہے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی الجھاؤ نہیں۔ کوئی پیچ نہیں، خم نہیں، ابہام نہیں، کوئی تہ دار بات نہیں۔ اس پر غور و فکر کرنے سے اس کے معانی آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اس میں زیادہ تر محسوس امور ہی سے بحث کی گئی ہے لیکن جہاں کہیں مجرد حقائق (Abstract Truths) کا ذکر آیا ہے تو (جیسا کہ ایک اعلیٰ درجہ کی کتاب کا قاعدہ ہوتا ہے) انھیں محسوس تشبیہات میں بیان کر دیا گیا ہے۔ (انہی کو سلیم! متشابہات کہتے ہیں) ان میں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان تشبیہات سے کیا بات سمجھانی مقصود ہے اور یہ چیز علم کی پختگی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ اس کے الفاظ کا کوئی باطنی مفہوم ہے جسے صرف خاص خاص لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ وہ تمام نوعِ انسانی کے لئے راہ نمائی کا ضابطہ ہے اس لئے اس کے مطالب تمام نوعِ انسانی کے سامنے یکساں طور پر کھلے ہیں۔ اس میں نہ زمان کی قید ہے نہ مکان کی۔ وہ خود روشن (نور) ہے اور جو بھی اس سے راہ نمائی حاصل کرنا چاہے اسے روشنی عطا کر دیتا ہے۔ یہ ہے قرآن کی پوزیشن۔

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اسے سلیم! سامنے رکھو اور پھر غور کرو کہ قرآن نے کس طرح تصوف کی اصل و بنیاد کو ختم کر دیا۔ تم نے شروع میں دیکھا ہے کہ تصوف کی عمارت ان اقنومِ ثلاثہ پر قائم ہوتی ہے۔

(۱) ہر انسان خدا کے ساتھ براہِ راست ہم کلام ہو سکتا ہے۔ (قرآن نے ختمِ نبوت کا اعلان کر کے، خدا سے براہِ راست ہم کلام ہونے کا دروازہ بند کر دیا۔

(۲) انسانی روح، خدا کی ذات کا ایک حصہ ہے جو اس سے الگ ہو کر مادی دنیا میں چکر کاٹ رہی ہے۔ آخر الامر یہ خدا کی ذات میں جا کر جذب ہو جاتی ہے۔ یہ انسانی زندگی کا منتہیٰ اور کمال ہے۔ (قرآن نے خدا کو ایک مکمل ذات بتا کر اس باطل تصور کی جڑیں کاٹ ڈالیں۔ اس نے کہا کہ جس طریقِ پیدائش میں کسی کا ایک حصہ اس سے الگ ہو کر ایک جداگانہ شکل اختیار کر لیتا ہے، اسے تولید (Procreation) کہتے ہیں۔ خدا نے انسان کو تولید کے سلسلہ سے پیدا نہیں کیا۔ (لم یلد ولم یولد)۔ اس نے انسان کو (Create) کیا ہے۔)

(۳) آسمانی کتابوں کے حقیقی معانی ان کے الفاظ میں نہیں ہوتے۔ ان کے باطنی معنی ہوتے ہیں جو کشف و الہام سے سمجھ میں آسکتے ہیں (قرآن نے کشف و الہام کے احکام کو ختم کر کے اور اپنے آپ کو عربی زبان کی واضح کتاب کہہ کر اس تصور کو سرے سے مٹا دیا۔)

ان حقائق کی روشنی میں سلیم! (میرا خیال ہے کہ) تم بے ساختہ کہہ اٹھو گے کہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ قرآن اور تصوف بالکل متضاد بنیادوں پر اٹھی ہوئی عمارتیں ہیں اور قرآن فی الواقعہ تصوف کی باطل عمارت کو منہدم کرنے کے لئے آیا تھا۔

اس کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر کچھ اور لکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن چونکہ تم نے یہ بھی پوچھا ہے کہ پھر اسلام میں تصوف آ کہاں سے گیا، اس لئے اس کے متعلق بھی مختصر الفاظ میں لکھنا ضروری ہو گیا۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو یہ سمجھ لو کہ اور تو اور، خود صوفی بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ لفظ تصوف کے بنیادی معنی کیا ہیں۔ اس کا مادہ کیا ہے اور صوفی کو صوفی کیوں کہتے ہیں۔ بعض اس لقب کو اصحابِ صُفہ کے نام سے ماخوذ سمجھتے ہیں۔ [یعنی وہ صحابہؓ جو مدنی زندگی کے ابتدائی ایام میں پناہ گزینوں (Refugees) کی طرح بے سروسامانی کے حالت میں مسجد نبوی کے ایک چبوترے پر رہا کرتے تھے۔] بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ صفا سے مشتق ہے۔ بعض اسے یونانی لفظ صوفیا (Sophie) سے ماخوذ سمجھتے ہیں۔ جس کے معنی عقل و دانش کے ہیں اور جو لفظ فلسفہ (Philosophy) کی ترکیب میں شامل ہے۔ لیکن اکثر کا خیال یہ ہے کہ یہ لفظ صوف (اون) کی نسبت سے وضع کیا گیا ہے، کیونکہ یہ لوگ اُون کے موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں میں پہلا شخص جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوا ابوہاشم عثمان بن شریک تھا اور صوفیوں کی پہلی خانقاہ سنہ ۱۴۰ھ میں رملہ کے قریب (جو فلسطین میں واقع ہے) قائم ہوئی۔ ابوہاشم کوفہ کا رہنے والا تھا اور وہاں سے اٹھ کر رملہ کی خانقاہ میں آ گیا تھا۔ یہاں سنہ ۱۶۰ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ اگرچہ صوفیوں کی پہلی خانقاہ فلسطین میں قائم ہوئی جو عیسائیوں کے مسلک خانقاہیت کا مرکز تھا۔ لیکن تصوف کے بنیادی تصور کو اسلام میں ایرانیوں نے داخل کیا۔ مسلمانوں نے ایرانیوں کو جتنی بڑی شکست دی تھی وہ اس کا بدلہ جنگ کے میدان میں نہیں لے سکتے تھے۔ اس کے لئے انھوں نے دوسرے میدان تجویز کئے۔ وہ مسلمان ہو کر اسلامی مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں آ گئے اور یہاں پہنچ کر اپنے آبائی تصورات کو عام کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی قوت کا راز قرآن کی تعلیم میں ہے، اسلئے وہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمان کو قرآن سے بیگانہ نہ بنایا جائے اس کی قوت میں ضعف نہیں آ سکتا۔ وہ قرآن کے الفاظ کو چھیڑ نہیں سکتے تھے اسلئے کہ اس کی حفاظت کا انتظام بڑا پختہ تھا۔ لہٰذا انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس کے الفاظ تو وہی رہیں لیکن ان الفاظ کا مفہوم یکسر بدل جائے۔ اس کیلئے ایک طریقہ تو وہ تھا جسے (مثلاً) طبری نے اختیار کیا۔ یعنی ہر آیت کی تفسیر کے لئے کوئی نہ کوئی روایت وضع کر لی اور اس آیت کے معنی اس روایت کی رو سے یہ کہہ کر کر دیئے کہ یہ معنی خود رسول اللہؐ نے بیان فرمائے ہیں۔ لہٰذا قرآن کے الفاظ تو وہی رہے لیکن ان الفاظ کا مفہوم کچھ سے کچھ ہو گیا۔ یہی مفہوم ہے جو ہمارے ہاں اُسوقت سے آجتک متوارث چلا آ رہا ہے۔ دوسری طرف انھوں نے یہ خیال پھیلانا شروع کر دیا کہ قرآن کے اصلی معنی اس کے الفاظ سے متعین نہیں ہو سکتے۔ اس کے الفاظ کے نیچے ایک باطنی مفہوم ہے جو قرآن کا مغز اور اس کی روح ہے۔ وضعی روایات کی رُو سے قرآن کی تفسیر کا سلسلہ آگے نہیں چل سکتا تھا کیونکہ روایات جسقدر بنانی ممکن تھیں اس زمانہ میں بن گئیں۔ لیکن اس باطنی طریق سے تفسیر کا طریق ہمیشہ کے لئے جاری رہ سکتا تھا۔ چنانچہ یہ سلسلہ جاری رہا اور آجتک جاری ہے۔ اس طریق سے اسلام کو جو نقصان پہنچا اس کے متعلق علامہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس

دستور العمل کو مسخ کر دیتا ہے۔ یہ ایک نہایت (subtle) طریق تنسیخ کا ہے۔ اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبیعت موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا یا بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بناء وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے۔ (اقبالنامہ ج ا ص ۳۵)

علامہ اقبال ؒ نے اپنے اس خط میں قرآن کے باطنی مفہوم کے علاوہ وحدت الوجود کے فلسفہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے متعلق تفصیل سے کسی اور وقت لکھا جائے گا۔ سردست تم اس نکتہ کو اچھی طرح سے سمجھ لو کہ، جیسا کہ حضرت علامہ نے لکھا ہے، قرآن میں باطنی مفہوم پیدا کرنا اسے منسوخ کر دینے کا ایک نہایت لطیف اور پر فریب طریقہ تھا جسے مسلمانوں میں اس طرح رائج کر دیا گیا۔ جیسا کہ تم پہلے دیکھ چکے ہو یہ وہی چیز تھی جو یہودی، عیسائی اور ایرانی تصوف میں ہر جگہ موجود تھی۔ لہٰذا یہی نظریہ مسلمانوں میں جہاں ایک طرف اسماعیلی شیعیت کا موجب بنا دوسری طرف اس نے تصوف کی بنیاد ڈالی دی۔

جیسا کہ تم دیکھ چکے ہو، باطنی معانی کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ ہر انسان کوشش کرنے سے کشف والہام کے ذریعے ان معانی کو براہِ راست خدا سے حاصل کرتا ہے۔ یعنی خدا اور بندہ کی براہِ راست ہمکلامی کا تصور۔ اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ جہاں باطنی مفہوم کے تصور نے قرآن کو عملاً منسوخ کر دیا، وہاں رسول اللہ ؐ کے بعد کشف والہام کے عقیدہ نے ختمِ نبوت کی مہر کو بھی توڑ دیا۔ وحی اور الہام میں صرف لفظی فرق ہے ورنہ اصل کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ دونوں کی عمارت اس بنیاد پر اٹھتی ہے کہ انسان کے پاس عقل کے علاوہ ایک اور ذریعۂ علم بھی ہے جس سے وہ خدا سے براہِ راست معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ اس طریق سے حاصل کردہ معلومات کو قرآن کی رو سے وحی کہا جاتا ہے اور تصوف کی زبان میں الہام۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اگر رسول اللہ کے بعد الہام کا امکان جاری رہے تو ختمِ نبوت کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہتی۔ چنانچہ رسول اللہ ؐ کے بعد جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، کشف والہام ہی کی رو سے کیا ہے۔

اس مقام پر شاید تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ جب الہام کے امکان سے ختمِ نبوت جیسے بنیادی عقیدہ کی تردید ہو جاتی ہے تو مسلمانوں میں اس عقیدہ کو رائج کیسے کر دیا گیا؟ اس کے لئے ایک بڑا خوبصورت طریقہ اختیار کیا گیا۔ پہلے یہ کہا گیا کہ رسول اللہ ؐ کو وحی کے علاوہ الہام بھی ہوتا تھا۔ اسے وحی خفی، یا وحی غیر متلو کا نام دیا گیا۔ (واضح رہے کہ رسول اللہ ؐ کے زمانے میں مسلمان ان اصطلاحات سے آشنا تک نہ تھے) اس عقیدہ نے دو کام کئے۔ ایک طرف ان روایات کو وحی کا درجہ حاصل ہو گیا جو قرآن کی تفسیر یا "اسلام کی تکمیل" کے لئے وضع کی جا رہی تھیں اور دوسری طرف قرآن کے باطنی مفہوم کے لئے سند ہاتھ آ گئی۔ اس کے علاوہ اس سے ایک اور بڑا فائدہ ہو گیا۔ ان لوگوں کو یہ خدشہ تھا کہ اربابِ شریعت کی طرف سے باطنی مفہوم کی مخالفت ہو گی۔ لیکن جب اربابِ شریعت نے اس اصول کو مان لیا کہ رسول اللہ ؐ کو وحی کے علاوہ الہام بھی ہوتا تھا اور ختمِ نبوت کے معنی سلسلۂ وحی کا ختم ہو جانا ہے نہ کہ سلسلۂ الہام کا۔ تو وہ اصولاً اہلِ باطن کی مخالفت کر ہی

نہیں سکتے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ان باتوں کو معیوب قرار دے سکتے تھے جو ان لوگوں سے شریعت کے خلاف سرزد ہوں۔ لیکن تصوف کی اصل اور بنیاد کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تھا وہ حربہ جس سے قرآن کے علی الرغم باطنیت جیسا قرآن کا دشمن عقیدہ عام ہوتا چلا گیا۔

دوسری طرف یہودیت اور نصرانیت کے تصوف نے پہلے ہی سے فضا کو ان خیالات سے معمور کر رکھا تھا۔ جو یہودی یا نصرانی مسلمان ہوئے انھوں نے اس تصور کو اپنے قدیمی رجحان کے عین مطابق پایا۔ اس لئے انھوں نے لپک کر گلے سے لگا لیا۔ نتیجہ یہ کہ تیسری صدی ہجری ہی میں خود مسلمانوں میں اسی زور شور سے خانقاہیں کھلنی شروع ہو گئیں جس طرح اس سے پہلے عیسائیوں کے ہاں ہوا تھا۔

اگر تصوف کے سلسلہ کی ابتداء ان لوگوں کے نام سے کی جاتی جنھوں نے فی الحقیقت اس کی ابتداء کی تھی تو ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو یہ خیال گذرتا کہ یہ ان کی اپنی اختراع ہے۔ اس کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ ان حضرات نے باطنی طور پر سلسلہ بسلسلہ رسول اللہؐ سے فیض حاصل کیا ہے۔ اور چونکہ یہ تصور ایرانیوں کا پیدا کردہ تھا اس لئے اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی نمایاں طور پر درمیان میں لایا گیا مثلاً حضرت جنیدؒ مرید تھے حضرت سری سقطیؒ کے، سری سقطیؒ مرید تھے حضرت معروف کرخیؒ کے، معروف کرخیؒ مرید تھے داؤد طائیؒ کے، داؤد طائیؒ مرید تھے حبیبؒ عجمی کے، حبیبؒ عجمی مرید تھے خواجہ حسن بصریؒ کے اور خواجہ حسن بصریؒ مرید تھے حضرت علیؓ کے جنھوں نے یہ باطنی علم رسول اللہؐ سے حاصل کیا تھا۔ حالانکہ تاریخ میں اتنی شہادت بھی نہیں ملتی جس سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ خواجہ حسن بصریؒ کی ملاقات کبھی حضرت علیؓ سے ہوئی تھی۔ اس کے برعکس اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی جنگ میں خواجہ حسن بصریؒ لوگوں کو غیر جانبدار رہنے کی تلقین اور حکام وقت کی اطاعت کی تاکید کرتے تھے۔ اگرچہ مجھے تو اس میں بھی شبہ ہی نظر آتا ہے ان کی پیدائش ۲۱ھ میں بتائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی جنگ کے زمانہ میں یہ بمشکل سولہ سترہ برس کے ہو سکتے ہیں۔ اتنی سی عمر میں ان کی ایسی بڑی پوزیشن بمشکل باور کی جا سکتی ہے کہ یہ اتنے بڑے اہم معاملہ میں لوگوں پر کوئی اثر رکھتے ہوں۔ لیکن یہ باتیں تو اہل ظواہر کی ہیں۔ صوفیہ کے نزدیک زمان و مکان کا بُعد کچھ حیثیت نہیں رکھتا اور سب کچھ بیٹھے بٹھائے ایک لمحہ میں ہو جاتا ہے۔ مثلاً چوتھی صدی ہجری میں حضرت جنیدؒ کے ایک مرید نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ان کے پیر و مرشد کو خرقۂ تصوف حضرت انس بن مالکؓ سے ملا تھا جو رسول اللہؐ کے صحابی تھے۔

میرا خیال ہے سلیم! تم اس مختصر سی سرگذشت سے یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ تصوف کے جراثیم اسلام میں کہاں سے اور کیسے آئے۔ اس خط میں میں تصوف کی پوری تاریخ بیان نہیں کر سکتا، لیکن چلتے چلتے ایک ایسی شخصیت کے متعلق دو چار باتیں ضرور سن لو جس نے تصوف کو ایک مستقل مذہب کی حیثیت دی اور جس کے بھرپور وار سے ملت اسلامیہ اس وقت تک سنبھل نہیں سکی۔ یہ تھے ہسپانیہ کے مشہور صوفی، محی الدین ابن عربی، جنھیں شیخ اکبر کہا جاتا ہے اور جن کی فتوحاتِ مکیہ اور فصوص الحکم تصوف کا عروۃ الوثقیٰ سمجھی جاتی ہیں۔ وہی فصوص الحکم جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ

جہاں تک مجھے علم ہے، فصوص الحکم میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔ (اقبال نامہ ج ۱ ص ۴۴)

یہ چھٹی صدی ہجری میں اندلس میں پیدا ہوئے اور ۶۳۸ھ میں دمشق میں وفات پائی، جہاں ان کے مزار پر ایک بہت بڑا گنبد ہے۔ اس زمانہ میں

ہسپانیہ میں متصوفین فلاسفرز کا ایک گروہ تھا جو وحدتِ وجود کے قائل تھے۔ وہ اپنی کیفیات اور احوال کو تشبیہ اور استعارہ کے رنگ میں بیان کیا کرتے تھے۔ اور اپنے عشقِ حقیقی کو عشقِ مجازی کے جاذب نگاہ لباس میں پیش کیا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن عربی انہی سے متاثر ہوئے۔ انہی کا فلسفہ، انہی کا اندازِ بیان، حتیٰ کہ انہی کا سا عشقِ مجازی بھی۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ جب وہ مکہ میں مقیم تھے تو ایک دوشیزہ کی طرف ان کا میلان ہو گیا تھا اور ان کے اکثر مکاشفات کا روحانی جذبہ اسی کے عشق کا رہینِ منت ہے۔ ان کے ملفوظات اور یہودی تصوف کی بنیادی کتاب "زہار" میں بڑی مطابقت پائی جاتی ہے۔ دونوں الہامی کتابوں کی تاویل اپنے ذاتی مکاشفات کی بنا پر کرتے ہیں۔ حروف اور اعداد سے پراسرار معانی اخذ کرتے ہیں۔ خوابوں کی تعبیر پر حقائق کی عمارتیں تعمیر کرتے اور انسانی مقدر کو ستاروں کے اثرات کے تابع مانتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے لکھا ہے کہ مسلمانوں میں وحدتِ وجود کا عقیدہ بدھ مت سے آیا ہے لیکن یہ کہیں سے بھی آیا ہو اسے ایک منظم مذہب کی حیثیت ابن عربی نے ہی دی ہے۔ اور ستم ظریفی یہ کہ وہ اس کی سند بھی قرآن سے پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ لیکن وہ سندیں کس قسم کی ہیں۔ اس کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ قرآن کریم میں زمین کے متعلق ہے کہ منہا خلقنٰکم وفیہا نعیدکم ومنہا نخرجکم تارۃً اخریٰ۔ اس کا صاف ترجمہ یہ ہے کہ ہم نے تمہیں اسی زمین سے پیدا کیا، اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں بارِ دیگر نکالیں گے۔ ابن عربی صاحب اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

ہم سب احدیت سے نکلے تھے۔ فنا ہو کر پھر احدیت میں جا چھپیں گے، پھر لقا ملیگی اور دوبارہ پھر نمودار ہوں گے (فصوص الحکم)

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ جس بنیادی عقیدہ کی رو سے تصوف، اسلام کے مدِ مقابل کھڑا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد خدا کے ساتھ براہِ راست ہمکلامی کا سلسلہ جاری ہے۔ ابن عربی کا عقیدہ ہے کہ اربابِ باطن دین کے متعلق اپنے علم کو خدا اور رسول دونوں سے براہِ راست حاصل کرتے ہیں۔ خدا کے متعلق ان کا ارشاد ہے کہ

جس مقام سے نبی لیتے تھے اسی مقام سے انسانِ کامل صاحب الزماں، غوث، قطب لیتے ہیں۔

اور احادیث کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ احادیث

روایت[1] بالمعنی اور ذاتی فہم کی غلطی سے معصوم نہیں۔ لہٰذا اولیاء ان کے متعلق رسولِ خداؐ سے براہ راست دریافت کر لیتے ہیں[2]۔ اگرچہ اولیاء، انبیاء کے تابع ہوتے ہیں لیکن صاحبِ وحی دونوں ہوتے ہیں۔ . . . . . اگرچہ رسول اللہؐ کے خلفاء (یعنی اولیاء) دائرۂ شرع سے باہر نہیں نکل سکتے لیکن یہاں ایک دقیقہ ہے جسے ہمارے ہی جیسے شخص جان سکتے ہیں۔ اور وہ دقیقہ یہ ہے کہ جب یہ شرعِ رسول پر حکم کرتے ہیں تو ان کا ماخذ کیا ہوتا ہے۔ یہ کہاں سے حکم دیتے ہیں؟ اربابِ شریعت تو وہ ہیں جو قرآن و حدیث سے حکم دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں مصرح حکم نہیں ملتا تو قیاس کرتے ہیں، اجتہاد

---

[1] میں نے فصوص الحکم کے ترجمہ میں مولانا عبدالقدیر صاحب صدیقی کے اس ترجمہ کو سامنے رکھا ہے جو ۱۹۴۲ء میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوا تھا مندرجہ اقتباسات ان کے مختلف حکم سے لئے گئے ہیں بالخصوص حکمت وجودیہ فی کلمۂ داؤدیہ سے۔ (پرویز)

[2] آپ نے غور کیا کہ مودودی صاحب جو فرماتے ہیں کہ حدیث کے غلط اور صحیح ہونے کا فیصلہ مزاج شناس رسولؐ کر سکتا ہے تو وہ کس مقام کو بولتے ہیں (طلوع اسلام)

کرتے ہیں مگر اس اجتہاد کی اصل وہی منقول قرآن وحدیث ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف والہام کے ذریعہ خود اللہ تعالیٰ سے لیتے ہیں۔ لہٰذا خود اس حکم شرعی میں خلیفۃ اللہ ہوتے ہیں۔ پس ایک طور پر مادۂ کشف والہام اور مادۂ وحیٔ رسول ایک ہے[1] . . . . صاحبِ کشف اللہ تعالیٰ سے لینے کے طریقے سے واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النبیین کے موافق ہے . . . . ان کا اللہ تعالیٰ سے لینا عین رسول اللہؐ کا لینا ہے . . . . . یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ کا انتقال ہوگیا اور آپ نے منصوص و معین طور پر کسی کو خلیفہ نہ بنایا کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ ان کی امت میں ایسے لوگ ہوں گے جو خلافت کو اللہ تعالیٰ سے لیں گے اور خلیفۃ اللہ ہوں گے . . . . . .

پس خلقِ خدا میں خلیفۃ اللہ ہیں۔ وہ معدنِ خاتم النبیین و مادۂ انبیاء سابقین سے وہ احکام لیتے ہیں جو خود انھوں نے لئے تھے . . . . . . خدا تعالیٰ ایسے خلیفہ کو وہی احکام شرعیہ اور علوم دیتا ہے جو خاص کر کے انبیاء کو دیئے گئے تھے۔ اگرچہ خلیفہ ولی ظاہر میں متبع نبی اور اس کا غیر مخالف رہتا ہے۔

دوسری جگہ یہ صاحب لکھتے ہیں:

کبھی خلیفہ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حکم حدیث کے خلاف ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ اس کا اجتہاد ہے۔ حالانکہ واقعہ ایسا نہیں اصل یہ ہے کہ اس کے کشف کی رو سے یہ حدیث ثابت نہیں۔ اگرچہ وہ حدیث عن عدل عن عدل سے ثابت ہو۔

میں سلیم اسی ضمن میں اور بھی بہت کچھ نقل کر دیتا۔ لیکن ایک تو خط میں اتنا کچھ آ نہیں سکتا اور دوسرے میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی اصطلاحی چیزوں سے تمہاری طبیعت بہت جلد اکتا جایا کرتی ہے۔ لیکن جتنا کچھ میں نے لکھا ہے اس سے تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ایک نبی کی وحی اور ان لوگوں کے الہام میں صرف اصطلاحی فرق ہے۔ معنوی طور پر کچھ فرق نہیں۔ دونوں کا مفہوم خدا سے براہِ راست علم حاصل کرنا ہے۔ یہ لوگ کہدیتے ہیں کہ اگرچہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہوتا ہے لیکن وحی یقینی علم ہوتا ہے اور الہام ویسا یقینی نہیں ہوتا۔ لیکن یہ فرق صرف کمیت (Quantity) یا درجہ (Degree) کا فرق ہے۔ کیفیت (Quality) یا نوعیت کا فرق نہیں۔ سرچشمہ (Source) ان دونوں کا ایک ہے۔ یعنی خدا سے براہِ راست حاصل کردہ علم۔ اس سے تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا سلیم! کہ جب الہام کے امکان کو مان لو تو پھر نبوت کا دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے۔ مسلمانوں میں تمام مدعیانِ نبوت اسی راستہ سے آئے ہیں۔ اس کشف والہام کی رو سے قرآن کو جو باطنی معنی پہنائے جاتے ہیں، ایک آدھ نمونہ اس کا بھی دیکھ لو تا کہ بات نکھر کر تمہارے سامنے آ جائے۔ ابن عربی کلمۂ موسویہ میں لکھتے ہیں کہ

فرعون کے بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے میں کیا حکمت تھی اور کیا راز تھا؟ اس کا راز یہ تھا کہ جو جو لڑکے موسیٰ کے واسطے مارے گئے تھے ان کی زندگی سے موسیٰ کو امداد ملے۔ کیونکہ وہ لڑکے موسیٰ سمجھ کر مارے گئے تھے تو ضرور ان سب بچوں کی حیات جو موسیٰ سمجھ کر مارے گئے تھے حیاتِ موسوی کی طرف عود کرے گی۔ ان معصوم بچوں کی حیات طاہر تھی فطرت پر تھی بلکہ وہ قالوا بلیٰ کے

---

[1] آپ نے دیکھا کہ مرزا غلام احمد کو ان کی وحی اور الہام کی سند کہاں سے مل رہی ہے۔ (طلوع اسلام)

عہد پر قائم تھے۔ لہٰذا موسیٰ ان سب متقولین کی حیات کا مجموعہ تھا۔ وہ بہت سی روحوں کا مجموعہ تھا اور بلند مقام پر تھا کیونکہ بچہ کو اللہ کے پاس سے آئے ہوئے تھوڑی مدت ہوتی ہے۔

آگے چل کر یہ صاحب یہ کہنے کی بھی جرأت کرتے ہیں کہ فرعون ایمان پر مرا تھا اور اس کی بخشش ہو چکی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ تو یہاں تک بھی لکھ گئے ہیں (جس کے نقل کرنے سے میرا قلم تھرتھراتا اور روح کانپتی ہے) کہ

پس فرعون کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے انا ربکم الاعلیٰ کیونکہ فرعون ذاتِ حق سے جدا نہ تھا۔ اگرچہ اسکی صورت فرعون کی تھی۔

اب تم نے سمجھ لیا ہوگا سلیم کہ علامہ اقبالؒ نے کیوں کہا تھا کہ فصوص ہیں الحاد و زندقہ کے سوا کچھ نہیں۔ اقبال ہی نہیں بلکہ اور بھی کئی اربابِ علم حتیٰ کہ بعض "طریقوں" کے صوفیہ نے بھی اس کی مخالفت کی ہے۔ لیکن اس مخالفت سے کچھ نہیں بنتا۔ اگر اس اصل کو قائم رکھا جائے جس پر تصوف کی عمارت قائم ہے۔ صوفیہ میں بعض ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہیں مثلاً وحدتِ شہود کے مدعی وحدتِ وجود کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن تصوف کی اصل و بنیاد کو سب محفوظ رکھتے ہیں۔ اور جو شخص اس کی طرف انگلی اٹھائے اس کی مخالفت میں سب متفق ہو جاتے ہیں۔ اسی قسم کی مخالفت نے آجکل ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے یعنی عجمی تصوف اور اسلامی تصوف۔ اس امتیاز کی وجہ بڑی دلچسپ ہے۔ ایک چیز ہے تصوف اور ایک چیز ہے تصوف کا ضابطۂ اخلاق (Ethics of Mysticism) تصوف کا ضابطۂ اخلاق یہ ہے کہ دنیا کو چھوڑ دو آرزوؤں کو ترک کر دو محکومی اور سرنگونی کی زندگی بسر کرو افلاس اور محتاجی کو خدا کی رحمت سمجھو، قوت اور شوکت کو خوئے درندگی جانو اور مسلک گوسفندی اختیار کرو۔ ہمارے زمانہ میں علامہ اقبالؒ نے تصوف کے اس ضابطۂ اخلاق کی سخت مخالفت کی اور قرآن کے پرشکوہ اور باعظمت، زندہ اور زندگی بخش مسلکِ حیات کی عام تبلیغ کی۔ چونکہ اہلِ تصوف اس دور میں یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ ضابطۂ اخلاق فی الواقعہ اسلام کی تعلیم کا مظہر ہے اسلئے انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ عجمی تصوف ہے اسلامی تصوف نہیں۔ یعنی یہ لوگ جس تصوف کے وارث ہیں وہ اسلامی ہے اور جس تصوف کی مخالفت ہو رہی ہے وہ عجمی ہے۔ حالانکہ تصوف نہ عجمی ہے نہ اسلامی۔ یہ ایک غیر اسلامی تصور ہے جو غیر مسلموں میں بھی پایا جاتا ہے اور مسلمانوں میں بھی۔ جس طرح جھوٹ مسلمانوں کے ہاں آکر سچ نہیں بن سکتا اسی طرح کوئی غیر اسلامی نظریہ مسلمانوں کے ہاں رواج پا کر اسلامی نہیں بن سکتا۔ یہ کہنا کہ حافظ کا تصوف عجمی ہے اور رومی کا تصوف اسلامی۔ تصوف کی اصل و بنیاد سے ناواقفی نہیں تو تسامح ضرور ہے۔ ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ضابطۂ اخلاق کا ہے۔ نہ کہ تصوف کا۔ مثلاً حافظ کے ہاں سکوت و سکون ہے اور رومی کے ہاں اکثر مقامات پر حرارت اور گرم جوشی۔ لیکن اس کے باوجود دونوں صوفی ہیں۔ بلکہ رومی اس باب میں حافظ سے بھی زیادہ شدید صوفی ہے۔ وہ باطنی ذریعۂ علم کو حافظ سے بھی زیادہ قابلِ اعتماد ذریعہ مسلم قرار دیتا ہے۔ جہاں تک قرآن کے باطنی مفہوم کا تعلق ہے رومی کا یہ دعویٰ ہے کہ

مازِ قرآں مغز را برداشتیم　　استخواں پیشِ سگاں انداختیم

یہ "مغزِ استخواں" وہی ہے جسے باطنی مفہوم کہا جاتا ہے اور "استخواں" (معاذ اللہ معاذ اللہ) وہ قرآن ہے جو عربی الفاظ میں لکھا ہوا ہے جب مثنوی کو "قرآن در زبانِ پہلوی" کہنے والوں کے سامنے یہ اعتراض پیش کیا جائے تو وہ کھسیانے سے ہو کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ مولانا کا اس سے

مطلب یہ ہے کہ ہم نے قرآن کے معانی لیلئے ہیں۔ الفاظ سے ہمارا سروکار نہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ کیا دنیا میں بغیر لفظ کے بھی کوئی معنی ہوتا ہے؟ تم سمجھے سلیم! کہ یہ کیا بات ہوئی۔ بات وہی ہوئی جو میں نے اوپر لکھی ہے کہ یہ حضرات اس مفہوم کو اصل مفہوم سمجھتے ہی نہیں جو قرآن کے الفاظ سے متعین ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک قرآن کا صحیح مفہوم وہ ہے جو انھیں کشف والہام کے ذریعہ براہ راست خدا سے ملتا ہے۔ اور یہی ہے تصوف کی وہ بنیاد جو قرآن کے یکسر خلاف ہے۔ لہٰذا اس بنیاد کی رو سے نہ رومی کا تصوف اسلامی ہو سکتا ہے نہ حافظ کا تصوف فی ذاتہٖ ایک غیر اسلامی نظریہ ہے اور اقبالؒ کے الفاظ میں "سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا"۔

بعض لوگ کہدیتے ہیں کہ تصوف سے مراد صرف "اخلاص فی العمل" ہے۔ یعنی نیک کام دکھاوے کی خاطر نہ کئے جائیں بلکہ مخلصانہ طور پر خدا کی رضاجوئی کی خاطر کئے جائیں۔ ذرا سوچو سلیم! کہ کیا اسلام یہ سکھاتا ہے کہ نیک کام ریاکاری سے کئے جائیں جو اخلاص فی العمل کے لئے اسلام کو چھوڑ کر تصوف کی الگ اصطلاح کی ضرورت پڑ گئی؟ قرآن ریاکاری اور منافقت کو بدترین جرم قرار دیتا ہے اور ایسا کرنے والوں کو جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں پھینکتا ہے۔ اس نے ریاکاروں کے لئے منافق اور مخلصین کے لئے مومن کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ان قرآنی اصطلاحات کو چھوڑ کر ہمیں اور اصطلاحات تلاش کرنے کی ضرورت کیا ہے، بالخصوص جبکہ وہ اصطلاحات (تصوف اور صوفی) اس قدر غیر قرآنی تصورات کی حامل ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ تصوف کی مدافعت کی کوشش کرتے ہیں ان کی اس کوشش کا جذبہ محرکہ وہی ہوتا ہے جو دیگر غیر قرآنی معتقدات وتصورات کی مدافعت میں کارفرما ہوتا ہے۔ یعنی اسلاف پرستی کا جذبہ۔ تصوف میں پہنچکر یہ جذبہ اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ صوفیا (اولیاء اللہ) کا جو مرتبہ ان کے معتقدین کے دل میں ہوتا ہے وہ خدا کا بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ اس بات کا خیال تک بھی دل میں لانا کفر سمجھتے ہیں اور اس سے لرز جاتے ہیں کہ ان حضرات کے مسلک کو تنقید کی نگاہ سے دیکھیں۔ خواہ وہ تنقید خالص قرآن کی کسوٹی ہی سے کیوں نہ کی جاتی ہو۔ لیکن سلیم! یاد رکھو، جب تک ہم یہ مسلک (Attitude) اختیار نہیں کریں گے کہ اپنے مروجہ عقائد اور تصورات کو قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھیں اور ایسا کرنے میں کسی اور خیال کو اثر انداز نہ ہونے دیں، اسوقت تک ہم اس ضابطۂ زندگی (الدین القیم) کے قریب تک بھی نہیں آسکیں گے جسے خدا نے ہمارے لئے تجویز کیا تھا۔

باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ ان لوگوں سے بعض اوقات ایسی باتیں (کرامات) سرزد ہوتی ہیں جن کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی۔ تو اس کے متعلق اس خط میں اس سے زیادہ لکھنے کی گنجائش نہیں کہ ان باتوں کو دین سے کوئی علاقہ نہیں۔ ہر انسان کے اندر ایک قوت ہے (جسے قوتِ خیال کہہ لو یا (Will-power) جسے اگر خاص طریقوں سے (Develop) کر لیا جائے تو اس سے ایسی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں جو ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتیں جنھوں نے ایسا نہ کیا ہو۔ یہ کچھ ہر انسان کر سکتا ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی تمیز نہیں۔ ہندو سادھوؤں اور سنیاسیوں سے (جو علانیہ بت پرستی کرتے ہیں) ایسی ایسی "خارق عادات" باتیں سرزد ہوتی ہیں جو مسلمان پیروں سے بھی نہیں ہوتیں۔ اس باب میں تمہیں یہ سنکر شاید تعجب ہوگا کہ میری عمر کا ایک بڑا حصہ انہی وادیوں میں گذرا ہے اور میں نے یہ سب کچھ خود آپ کر کے دیکھا ہے۔ اس کے لئے میں اپنے ہاں کی خانقاہوں تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ سادھوؤں کی سمادھیوں تک سے بھی ہو آیا ہوں

وہاں یہی دیکھنے گیا تھا کہ اگر یہ "کرامات" دینِ اسلام کا مغز ہیں تو پھر مشرکین سے یہی کچھ کیسے سرزد ہو جاتا ہے! لہٰذا اس باب میں، میں کہہ سکتا ہوں کہ ــــ قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید۔

لیکن اس ضمن میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس لئے کہ (تم تو شاید ضبط کر لو لیکن) اگر طاہرہ نے سن پایا تو وہ توسر ہو جائیگی کہ چچا! کچھ ہمیں بھی دکھایئے۔ زیادہ نہیں تو مائی جیبو کی بیٹی کا جن ہی نکال دیجئے! اسے کیا معلوم کہ یہ جن نکالنے تو بہت آسان ہیں لیکن وہ جن جو پوری کی پوری ملتِ اسلامیہ کو صدیوں سے چمٹے چلے آرہے ہیں ان کا نکالنا کسقدر مشکل ہے۔ اور ان جنات میں سے یہ جن تو بہت ہی بڑا خطرناک ہے کہ ختمِ نبوت کے بعد الہام کا دروازہ کھلا ہے اور انسان خدا سے براہِ راست ہمکلام ہو سکتا ہے۔ یاد رکھو سلیم! رسول اللہؐ کے بعد خدا سے "ہمکلام" ہونے کا ذریعہ صرف قرآن ہے اور قرآن کا مفہوم وہی ہے جو اس کے الفاظ سے متعین ہوتا ہے۔ اس کا کوئی باطنی مفہوم نہیں۔

اب سمجھے تم کہ تصوف کا عقیدہ کس طرح ختمِ نبوت اور قرآن کی اکملیت کی عمارت کو بنیادوں تک سے گرا دیتا ہے۔ اور یہ کہ جو اسلام کے ہاتھوں میدانِ جنگ میں پٹے تھے انھوں نے اسے کس طرح مدرسوں اور خانقاہوں میں پہنچکر پچھاڑا ہے!

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن ـ جلد چہارم)

ترجمانِ حقیقت جناب پرویز کا قلم اور سیرت صاحبِ قرآن علیہ التحیۃ والسلام خود قرآن کے آئینے میں۔ فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پونے دو سو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائناتؐ، جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط اور حسین، گرد پوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صحیح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین ـ قیمت بیس روپے۔ محصول ڈاک و پیکنگ ایک روپیہ ساڑھے چھ آنے۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی

معارف القرآن

کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں لیکن ان میں سے پہلی تین جلدیں مدت سے نایاب ہیں۔ قرآنی ذوق رکھنے والوں کے پیہم تقاضوں کے پیش نظر جناب پرویز نے ان جلدوں پر نظر ثانی کی ہے اور (علاوہ دوسری تبدیلیوں کے) ان کی ترتیب کو بھی بدل دیا ہے۔ چنانچہ

معارف القرآن جلد دوم

اب سلسلہ کی پہلی کڑی قرار دی گئی ہے اور اس کا نام رکھا گیا ہے:

ابلیس و آدم

اس میں انسانی تخلیق (نظریۂ ارتقاء) قصۂ آدم۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی اور رسالت سے متعلق مباحث شامل ہیں۔

ایسے اہم عنوانات۔ قرآن کی تعلیم۔ اور جناب پرویز کا قلم

آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ کتاب کیا ہوگی!

یہ کتاب بڑی تقطیع ($22 \times 29\frac{1}{8}$) کے ۳۷۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ چھپ کر تیار ہو گئی ہے اور انشاء اللہ دسمبر کے دوسرے ہفتہ میں روانگی شروع ہو جائے گی۔ اور جس ترتیب سے فرمائشیں آئیں گی اسی ترتیب سے اس کی روانگی ہوگی۔ لہٰذا اپنی فرمائش بہت جلد بھیجئے۔ قیمت مجلد مع گرد پوش آٹھ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

جن حضرات کا روپیہ ہمارے پاس جمع ہے ان میں سے وہی صاحب اطلاع دیں جنہیں یہ کتاب درکار نہ ہو۔ باقی سب کو کتاب از خود بھیجدی جائے گی۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی

اسلام پر
مختلف غیر اسلامی ثقافتوں کے اثرات

(از علامہ محترم احمد امین استاذ کلیۃ الاداب بالجامعۃ المصریہ)

(ضحی الاسلام جلد اول کے ایک باب سے ماخوذ)

[زیر نظر باب میں اس موضوع پر گفتگو کی گئی ہے کہ عباسیوں کے زمانہ میں اسلام پر کون کونسی غیر اسلامی ثقافتوں کا اثر پڑا اور یہ اثرات کن ذرائع اور اسالیب سے مسلمانوں کے اندر داخل ہوئے۔ ان خارجی ثقافتوں میں یہودی ثقافت اور نصرانی ثقافت زیادہ قابل ذکر ہیں]۔

یہودیت و نصرانیت

استاذ متز کہتے ہیں کہ قرون وسطیٰ میں جو چیز اسلامی مملکت کو نصرانی یورپ سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے پیرو کافی تعداد میں رہتے تھے جبکہ یورپ کی نصرانی مملکتوں کو یہ بات نصیب نہیں تھی۔ اسلامی مملکت میں کنیسے اور گرجے اسلامی مملکت کی مداخلت سے قطعاً آزاد تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ اسلامی مملکت کا جزو ہی نہیں ہیں۔ اس بارہ میں ان معاہدوں کی پابندی کی جاتی تھی جو فتح کے وقت عمل میں لائے جاتے تھے۔ اور ان معاہدوں کے مطابق جو حقوق ان کو حاصل تھے ان میں کوئی مداخلت نہیں کی جاتی تھی۔ ضرورۃً یہود اور نصاریٰ مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو آباد تھے۔ اس چیز نے تسامح اور چشم پوشی کی ایک ایسی فضا پیدا کر دینے میں بڑی مدد دی جو قرون وسطیٰ میں یورپ میں متعارف بھی نہیں تھی۔ ہر یہودی یا نصرانی اپنے دین کی پیروی کرنے میں آزاد تھا، البتہ اگر وہ مسلمان ہو کر پھر مرتد ہو جاتا تھا تو اس کو قتل کی سزا دی جاتی تھی[1]۔ جبکہ بیزنطینی مملکت میں ہر اس شخص کی سزا قتل ہوا کرتی تھی جو مسلمان ہو جائے۔

کنیسہ نے نصرانی مرد کے لئے غیر نصرانی عورت سے شادی کرنا حرام قرار دیا تھا بجز اس صورت کے کہ وہ عورت نصرانی مذہب اختیار کرے۔ ایسے ہی نصرانی عورت سوائے نصرانی مرد کے کسی سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن اسلام نے مسلمان عورت پر جہاں غیر مسلم مرد سے شادی کرنا حرام قرار دیا تھا وہیں مسلمان مرد کیلئے اسے حلال کر دیا تھا کہ وہ اہل کتاب یعنی یہودی اور نصرانی عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں چاہے وہ اپنے دین پر ہی کیوں نہ قائم رہیں۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد تھا:

الیوم احل لکم الطیبات وطعام الذین اوتوا الکتٰب حل لکم وطعامکم حل لھم والمحصنٰت من المؤمنات والمحصنٰت من الذین اوتوا الکتٰب۔

"آج تمہارے لئے پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں نیز اہل کتاب کا طعام بھی تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے اور تمہارا طعام ان کیلئے حلال کر دیا گیا ہے"

---

[1] قرآن کے بالکل خلاف۔ (طلوع اسلام)

ایسے ہی مؤمنات میں سے پاکدامن عورتیں اور اہلِ کتاب کی پاکدامن عورتیں بھی تمہارے لئے حلال کر دی گئی ہیں۔

چنانچہ بہت سے مسلمان یہودی اور نصرانی عورتوں سے شادیاں کر لیتے تھے جن میں سے بعض عورتیں اسلام قبول کر لیتی تھیں اور بعض عورتیں اپنے قدیم مذہب پر ہی رہتی تھیں۔ مسلمانوں کے یہود اور نصاریٰ کے ساتھ اتصال کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ شادیاں بھی تھیں۔ . . . .

. . . .

یہود اور نصاریٰ اسلامی مملکت میں پھیلے ہوئے تھے جن کی تعداد بڑی کافی تھی۔ بنیامین (ایک یہودی سیاح جس نے ۱۱۶۵ء یعنی ۵۶۰ھ میں اسلامی ممالک کا سفر کیا تھا) کا بیان ہے کہ عربوں کے علاوہ اسلامی مملکت میں صرف یہودیوں کی تعداد تین لاکھ کے قریب تھی جو دجلہ اور فرات کی نہر کے کناروں پر پھیلے ہوئے تھے نیز جزیرۂ ابن عمر، موصل، عکبرہ، واسط، بغداد، حلہ، کوفہ، بصرہ اور فارس کے بہت سے شہروں اصفہان، ہمدان، شیراز، غزنہ اور سمرقند میں آباد تھے۔ فارس میں دو آبادیاں ایسی تھیں جن کا نام ہی "یہودیہ" تھا جن میں سے ایک جرجان میں اور دوسری اصفہان میں تھی[۱] اس زمانہ میں خود بغداد میں تقریباً ایک ہزار یہودی آباد تھے۔ بغداد میں ایک محلہ تھا جس کا نام دَرْبُ الیہود تھا اس محلہ کی طرف بہت سے محدثین بھی منسوب ہیں چنانچہ ابو محمد عبداللہ بن عبید اللہ بن یحییٰ یہودی انہی میں سے ہیں[۲]۔ اوائل تیسری صدی ہجری میں صرف اہل بغداد سے ایک لاکھ تیس ہزار درہم جزیہ کی رقم وصول ہوتی تھی اور چوتھی صدی ہجری میں صرف اہلِ بغداد سے ایک لاکھ تیس ہزار درہم جزیہ کی رقم وصول ہوتی تھی اور چوتھی صدی ہجری کے شروع میں سولہ ہزار دینار وصول ہوتے تھے۔ ان رقوم کی تعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں صرف بغداد میں غیر مسلموں کی تعداد جو جزیہ ادا کرتی تھی قریب پندرہ ہزار کے تھی[۳]۔ ابن حوقل کہتے ہیں کہ شہر رہا اور تکریت میں نصاریٰ کی تعداد اس سے بہت زیادہ تھی۔

شام میں زیادہ تر سرمایہ دار یہود تھے اور بغداد میں محلات شاہی کے زیادہ تر طبیب نصاریٰ تھے۔ یہودی لوگ خاص خاص صنعتوں میں زیادہ مشہور تھے مثلاً صرافہ، ٹینری، زیورات سازی وغیرہ[۳]۔ جاحظ نے یہ بھی کہا ہے کہ نصاریٰ کرایہ کیلئے گھوڑے پالتے تھے عمدہ گھوڑوں کی پرورش کرتے تھے، سلکی اور ریشمی کپڑے پہنتے تھے، لوگوں کو ملازم رکھتے تھے اور حسن، حسین، عباس، فضل اور علی جیسے نام رکھتے تھے[۴]۔

بہرحال مسلمانوں کے درمیان بہت سے دوسرے مذاہب کے لوگ زندگی بسر کرتے تھے خصوصاً یہود اور نصاریٰ مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے۔ بلکہ مسلمان ان کو اپنا دوست بھی سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہودی اور نصرانی دوستوں کی مدح کا تذکرہ اکثر شعراء کے کلام میں ملتا ہے۔ . . .

بہرحال یہودیت اور نصرانیت کی ایک الگ ثقافت تھی جس میں سے بہت کچھ مسلمانوں کے اندر چپکے چپکے سرایت کرتی چلی گئی۔ اب ہم اس کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

یہودیت

یہودی ثقافت کا اہم ترین سرچشمہ تورات تھی جس کا تذکرہ قرآن کریم میں بھی آیا ہے۔ قرآن نے اس کا تعارف اس حیثیت سے کرایا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نازل فرمودہ کتابوں میں سے ایک کتاب تھی (انا انزلنا التوراۃ فیہا ھدی ونور۔ ہم نے تورات کو نازل کیا جس میں ہدایت اور نور تھا) قرآن کریم میں ہے کہ اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام آئے جو تورات کے احکام کی تصدیق کرتے تھے

[۱] معجم البلدان مادہ "یہودیہ"۔ [۲] متز (METS)۔ منقول از خرداذبہ۔ [۳] متز (METS) از جاحظ بر رسالہ "الرد علی النصاریٰ" ص۱۔ [۴] ثلاث رسائل ص۱۸

وقفینا علی اٰثارھم بعیسی ابن مریم مصدقا لما بین یدیہ من التوراۃ، واٰتیناہ الانجیل فیہ ھدی ونور، ومصدقا لما بین یدیہ من التوراۃ وھدی وموعظۃ للمتقین۔ (ہم نے ان کے پیچھے پیچھے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا جو اس تورات کی جو اس سے پہلے آچکی تھی تصدیق کرتا ہوا تھا اور ہم نے خود عیسیٰ ابن مریم کو انجیل دی تھی جس میں ہدایت اور نور تھا اور انجیل بھی اپنے سے پہلی کتاب یعنی تورات کی تصدیق کرتی تھی اور تقویٰ شعار لوگوں کیلئے ہدایت اور موعظت تھی)۔ قرآن کریم نے ان بعض احکام کو صراحۃً بیان کیا ہے۔ جو تورات میں تھے۔ مثلاً وکتبنا علیھم فیھا ان النفس بالنفس والعین بالعین والانف بالانف والسن بالسن والجروح قصاص (ہم نے تورات میں ان پر مقرر کیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور تمام زخم برابر سرابر ہیں) احادیث میں بھی تورات کا اسی طرح تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کے بعض احکام بیان ہوئے ہیں مثلاً ابوداؤد میں ابن عمرؓ کی یہ حدیث ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ کو قفؔ کی طرف دعوت دی چنانچہ آپ ان کے مدرسہ میں تشریف لیگئے۔ انھوں نے کہا اے ابوالقاسم! (صلعم) ہم میں سے ایک آدمی نے ایک عورت کے ساتھ زنا کیا ہے۔ آپ فیصلہ فرما دیجئے۔ رسول اللہ صلعم کے لئے انھوں نے ایک گدا بچھایا اور آپ اس پر تشریف فرما ہوئے پھر آپ نے ان سے فرمایا کہ میرے پاس توریت لاؤ۔ چنانچہ توریت لائی گئی۔ رسول اللہ صلعم نے گدا اپنے نیچے سے نکالکر تورات کو اس پر رکھدیا اور فرمایا "میں تجھ پر ایمان لاتا ہوں اور اس پر بھی جس نے تجھے نازل فرمایا"۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اپنے میں سے کسی بہترین پڑھے لکھے عالم کو بلاؤ چنانچہ ایک نوجوان یہودی حاضر کیا گیا۔ اس کے بعد رجم کے واقعہ کا بیان ہے[1]

تورات کے متعلق مسلمانوں کے تین نقطۂ نظر ہیں۔ کچھ لوگوں کا تو خیال ہے کہ وہ ساری کی ساری یا اس کا اکثر حصہ تبدل و تغیر کیا ہوا اور محرف ہے۔ یہ وہ تورات نہیں جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی تھی۔ ان لوگوں نے دلیل میں موجودہ تورات کے تناقض و اختلاف اور ایک حصہ کی دوسرے حصہ کی تکذیب کو پیش کیا ہے[2]۔ ائمہ حدیث، فقہ اور کلام کی ایک بڑی جماعت کا یہ خیال ہے کہ تبدیلیاں جو کچھ واقع ہوئی ہیں وہ تاویل میں ہوئی ہیں نہ کہ خود تنزیل میں۔ امام بخاریؒ کا مذہب یہی ہے، چنانچہ وہ اپنی صحیح میں لکھتے ہیں یحرفون الکلم عن مواضعہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ لفظوں کو اپنے مقام سے ہٹا دیتے ہیں۔ مگر یہ کسی کی مجال نہیں ہو سکتی کہ اللہ تعالیٰ کی کسی کتاب کا کوئی لفظ اپنی جگہ سے ہٹا سکے بلکہ وہ اس کے معنی میں ایسی تاویل کر لیتے ہیں جو اس کا مفہوم نہیں ہوتا۔ اسی مذہب کو امام رازی نے اپنی تفسیر میں اختیار کیا ہے۔ ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ تورات کے نسخے مشرق و مغرب میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں جن کی تعداد کا علم سوائے خدا کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ یہ چیز عقلاً محال ہے کہ ان تمام نسخوں میں بالاتفاق تبدیل و تغیر کر دی جائے کہ ساری زمین پر ایک نسخہ بھی غیر محرف باقی نہ رہے۔ اور پھر یہ تبدیلی ایک خاص طریقے پر کی گئی ہو کہ ان تبدیلیوں میں بھی کوئی اختلاف نہ ہو۔ یہ ایسی بات ہے جسے عقل تسلیم نہیں کرتی بلکہ اس کے باطل ہونے کی شہادت دیتی ہے[3]۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اپنے نبی کی طرف سے یہودیوں کے خلاف استدلال کرتے ہوئے بیان فرمایا ہے: قل فاتوا بالتوراۃ فاتلوھا ان کنتم صادقین (پیغمبر اسلام! تم کہدو کہ اگر تم سچے ہو تو تورات لے آؤ اور اس کو پڑھ لو)۔ تیسری جماعت کا رجحان یہ ہے کہ اس میں کچھ اضافے

---

[1] ایسی ہی بخاری کا باب التوحید اور باب الاعتصام اور باب التفسیر ملاحظہ ہو۔ [2] ابن حزمؒ اپنی کتاب الفصل فی الملل والنحل میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور موجودہ تورات کے تناقض واضح کئے ہیں۔ [3] یہ مدعی سست گواہ چست والا معاملہ ہے۔ ان حضرات کے سامنے غالباً وہ تاریخی حقائق نہیں تھے جو خود اہل تورات کے مسلمات میں سے ہیں۔ بہرحال یہ ایسی چیز ہے کہ خود یہودی بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ تفصیل کیلئے "معراج انسانیت" میں یہودیت کا عنوان دیکھئے (طلوع اسلام)

کئے گئے ہیں اور کہیں کہیں تھوڑی سی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں۔ اس قول کو امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب "الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح" میں اختیار کیا ہے چنانچہ اس کا ایک نمونہ بھی انھوں نے پیش کیا ہے کہ تورات میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا "تو اپنا پہلوٹا بیٹا یا اپنا ایک بیٹا اسحٰق ذبح کردے"۔ اس عبارت میں "اسحاق" کا لفظ تورات کے الفاظ پر اضافہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کے دلائل بھی پیش کئے ہیں[1]۔

عموماً مسلمان تورات کا لفظ یہودیوں کی تمام مقدس کتابوں پر بولتے ہیں جو زبور وغیرہ کو بھی شامل ہوتا ہے جیسا کہ خود یہودی بھی اس لفظ کو عام معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

اس کے پہلو بہ پہلو یہودیوں کے ہاں احادیث (سنن) نصائح اور شروحات بھی پائی جاتی ہیں جو موسیٰ علیہ السلام سے کتابۃً منقول نہیں ہیں، یہ تمام چیزیں زبانی طور پر نقل ہوتی ہوئی آئی ہیں اور جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا ان کی ضخامت بھی بڑھتی چلی گئی۔ بعد میں ان کو مدون کر لیا گیا۔ اس کا نام ان کے ہاں "تلمود" ہے۔ تلمود کے بارہ میں یہودیوں میں اختلاف ہے۔ کچھ لوگ اس کی دینی حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ "رابنین" کی جماعت کہلاتی ہے اور کچھ لوگ ان کی اس حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ دوسری جماعت "قرائین" کے نام سے متعارف ہے۔ . . . . . .

ان دینی کتابوں کے پہلو بہ پہلو یہودی ادب، قصص، تاریخ، تشریع اور اساطیر سے متعلق بھی کتابیں پائی جاتی تھیں۔

یہودیت اور یونانی اصنامیت نیز یہودیت اور مسیحیت کے مابین مشرق میں زبردست کشمکش پائی جاتی تھی خصوصیت کے ساتھ اسکندریہ میں جو یونانی ثقافت کا اہم ترین مرکز تھا جس کی بنا پر اکثر یہودی اس پر مجبور ہو گئے تھے کہ یونانی زبان سیکھیں اور اس میں بات چیت کر سکیں۔ یہ کشمکش حیات اجتماعیہ، ثقافت اور دین غرضکہ تینوں منطقوں میں تھی۔ بہت سے یہودی اپنی حیات اور اپنے نقطۂ نگاہ کو یونانی حیات کے مطابق ڈھال لینے پر مجبور ہو چکے تھے ۔ ابتداءً وہ ان تھیٹروں میں جانے کو حرام سمجھتے تھے جہاں یونانی کہانیاں اسٹیج کی جاتی تھیں لیکن پھر وہ نئی نسل پیدا ہوئی جو اس میں قطعاً کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی تھی اسی طرح وہ آہستہ آہستہ یونانی ثقافت کو اختیار کرتے چلے گئے۔ اس دوران میں انھیں ایک نئی دشواری پیش آئی۔ یعنی یہ کہ انھیں یونانی تعلیمات کو کس حد تک قبول کر لینا چاہیے کہ یہودیت کے اصول و مبانی محفوظ رکھے جا سکیں۔ ان میں سے "فیلو" مشہور ترین ہستی گذرا ہے جس نے یہ کوشش کی کہ یہود کے دینی معتقدات اور یونانی علم و فلسفہ میں تطبیق پیدا کر دے۔ یہاں سے یہودیت نے فلسفہ کا چولا اختیار کرنا شروع کر دیا کہ وہ نہ صرف خالص یہودیت رہ سکی اور نہ خالص فلسفہ۔ "فیلو" نے افلاطون اور رواقیین کے علوم کا اقتباس کیا اور فلسفی اصطلاحات استعمال کیں۔ تاہم اس نے یہ سب کچھ دینی رجحانات کو زندگی بخشنے کیلئے کیا اور ان علوم سے اس نے یہی خدمت لی۔ اس نے ان مشکلات کو آسان بنایا جو یہودیت کے سامنے آ رہی تھیں۔ ایسے ہی اس کے بعد نصرانی کلیسا نے بھی یہودی فلسفہ کے مقابلہ میں وہی موقف اختیار کیا جو خود یہودیوں کا رہ چکا تھا۔ اس لئے کہ انھیں بھی وہی مشکلات پیش آئیں جو ان سے پہلے یہودیوں کو پیش آ چکی تھیں[2]۔

بہرحال یہود کی اپنی دینی، ادبی، تاریخی اور قانونی ثقافت تھی جو بعد میں یونانی ثقافت کے ساتھ مختلط ہو گئی۔

---

[1] ابن القیم جوزی کی کتاب "اغاثۃ اللہفان" صفحہ ۳۱۵ میں اس موضوع پر طویل بحث کی گئی ہے اسے دیکھ لیا جائے۔ [2] ملاحظہ ہو کتاب THE LIGACY OF ISRAEL کا وہ باب جس میں یہودیت اور یونانی فلسفہ کے باہمی تعلق پر بحث کی گئی ہے۔

قدیم زمانہ سے یہودی ثقافت آس پاس کے عربوں میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ چنانچہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہ قبیلہ — انصاری قبیلہ — اصنام پرست تھے جن کے پاس ہی یہودیوں کا یہ قبیلہ بھی آباد تھا جو اہل کتاب میں سے تھا — یہ لوگ علم میں اپنے مقابلہ میں ان کی فضیلت کو تسلیم کرتے تھے اور بہت سے اعمال میں ان کی پیروی کیا کرتے تھے۔[٣١] یہ اسلام سے ذرا پہلے کی بات ہے جیسا کہ حدیث کے تتمہ سے واضح ہو جاتا ہے۔

بعض مسلمان بھی ان زمانوں میں دوسری آسمانی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور ان کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ ابن سعد نے طبقات میں بیان کیا ہے کہ ابوالجلد جن کا نام جیلان بن فروہ ہے تمام کتابوں کو پڑھتے تھے۔ میمونہ بنت ابی الجلد سے روایت ہے کہ میرے والد قرآن کریم کو سات دن میں اور تورات کو چھ دن میں ختم کر لیا کرتے تھے۔ وہ تورات کو ناظرہ پڑھا کرتے تھے۔ جس دن وہ تورات کو ختم کیا کرتے تھے تو ہمارا گھر لوگوں سے بھر جایا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "کہا جاتا رہا ہے کہ تورات کے ختم ہونے کے وقت رحمتیں نازل ہوتی ہیں"۔[٣٢]

حدیث میں ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھتے اور مسلمانوں کیلئے عربی زبان میں اس کی تفسیر بیان کیا کرتے تھے تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اہل کتاب کی روایات کو نہ سچا سمجھو نہ جھوٹا اور کہہ دیا کرو کہ ہم ان کتابوں پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر اور تم پر نازل ہوئیں اور ہمارا اور تمہارا الٰہ ایک ہی الٰہ ہے۔[٣٣]

وہب بن منبہ سے منقول ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے بانوے (۹۲) کتابیں پڑھی ہیں جو ساری کی ساری آسمان سے نازل ہوئی ہیں جن میں سے بہتر (۷۲) کتابیں تو کنیسوں اور لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں اور بیس کتابیں ایسی ہیں جنہیں بجز چند آدمیوں کے اور کوئی نہیں جانتا۔[٣٤]

مختلف طریقوں سے یہ یہودی ثقافت مسلمانوں میں سرایت کرتی چلی گئی جن میں سے اہم ترین ذریعہ خود وہ یہودی تھے جو اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ خصوصاً یمن کے مسلمان ہونے والے یہودی جیسے کعب الاحبار، وہب بن منبہ وغیرہ۔ اسلام میں یہودی کثرت سے داخل ہوئے جن میں سے بعض صحابی اور تابعی بھی ہیں اور عباسی عہد تک داخل ہوتے چلے آئے۔ ان میں سے کچھ محدث ہیں کچھ قصاص ہیں۔ کچھ قراء ہیں۔ کچھ مورخ ہیں۔ عباسی عہد میں — ان میں سے بہت زیادہ مشہور — ابوعبیدہ معمر بن المثنیٰ ہیں — اب ہم ان معارف کی انواع بیان کرتے ہیں جو یہودیت سے متاثر ہوئیں۔

ان میں سب سے اول تفسیر قرآن ہے۔ قرآن کریم اور تورات — جیسا کہ ظاہر ہے — بعض مسائل بیان کرنے میں متفق ہیں خصوصیت کے ساتھ انبیاء کے قصص میں لیکن قرآن کریم کا انداز بیان تورات کے انداز سے قطعاً مختلف ہے۔ قرآن کریم صرف وعظ و نصیحت کے نکات پر اکتفا کرتا ہے اور مسائل کی تفصیلی جزئیات سے تعرض نہیں کرتا، وہ — اکثر — وقائع کی تاریخ ان شہروں کے نام جہاں وہ واقعات پیش آئے۔ ان اشخاص کے نام جن کے ہاتھوں بعض حوادث ظہور پذیر ہوئے، بیان نہیں کرتا اور تفصیلی جزئیات میں گھستا ہی نہیں بلکہ وقائع اور حوادث میں سے وہ چیزیں منتخب کر لیتا ہے جو موضوع کا جوہر اور مقام عبرت ہوتی ہیں — مثال کے طور پر ہم آدم کا قصہ لیتے ہیں جو قرآن کریم میں کئی جگہ آیا ہے۔ سب سے زیادہ طوالت کے ساتھ سورۂ بقرہ میں بیان ہوا ہے۔

---

[٣١] ابوداؤد۔ [٣٢] طبقات ابن سعد جلد ۶ ص ۱۱ قسم اول۔ [٣٣] بخاری میں ایک دوسری حدیث بھی ہے جو اس کی مخالف ہے اور جس میں اہل کتاب سے سوال کرنے کو منع فرمایا گیا ہے "باب شہادت اہل الکتاب" میں دیکھ لیا جائے۔ [٣٤] ابن سعد ص ۳۹۷ ج ۵۔

وقلنا یاآدم اسکن انت وزوجک الجنۃ وکلا منہا رغدا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ والذین کفروا بایٰتنا اولئک اصحاب النار ھم فیہا خالدون۔

یہاں سے تم دیکھ سکتے ہو کہ قرآن کریم نے جنت کا مقام نہیں بتایا۔ نہ اس شجرہ کی نوعیت بیان کی جس سے آدم کو کھانے سے منع کیا گیا تھا۔ نہ اس جانور کا ذکر کیا جسکا قالب اختیار کرکے شیطان نے آدم وحوا کو بہکایا تھا اور نہ آدم اور اللہ تعالیٰ کے درمیان گفتگو کی تفصیلات بیان کیں۔ نہ وہ مقام متعین کیا جہاں آدم کو جنت سے نکال کر پھینکا گیا تھا[1] وغیرہ ذالک۔ لیکن تورات ان تمام امور سے تعرض کرتی ہے اور بکثرت تعرض کرتی ہے۔ اس نے یہ بتایا ہے کہ یہ جنت عدن کے مشرق میں تھی۔ وہ درخت جس سے آدم اور حوا کو کھانے سے منع کیا گیا تھا اس کا نام شجرۃ الحیات تھا۔ اور معرفت خیر وشر کا شجرہ تھا۔ جس جانور نے حوا سے خطاب کیا تھا وہ سانپ تھا۔ اس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ خدا نے سانپ سے آدم وحوا کو بہکانے کی بنا پر یہ انتقام لیا کہ وہ اپنے پیٹ پر چلا کریگا اور مٹی کھایا کریگا۔ اور حوا سے یہ انتقام لیا کہ وہ اور اسکی نسل وضع حمل کے وقت دردِزہ کی تکلیف اٹھایا کریگی۔ مفسرین قرآن کا طبقہ آیا تو انھوں نے مسلمان ہونے والے یہودیوں سے یہ باتیں سن سن کر قرآن کی شرح میں داخل کرنی شروع کر دیں۔ چنانچہ امام طبری وہب بن منبہ سے نقل کرتے ہیں کہ اس درخت کا پھل ملائکہ اپنی حیات ابدی کیلئے کھایا کرتے ہیں۔ جب ابلیس نے آدم اور حوا کو پھسلانا چاہا تو سانپ کے پیٹ میں داخل ہو گیا۔ سانپ کے چار پاؤں ہوا کرتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بختی اونٹ ہو اور خدا کی حسین ترین مخلوقات میں سے تھا۔ جب سانپ جنت میں داخل ہو گیا تو ابلیس اس کے پیٹ سے باہر نکل آیا اور اس درخت کا پھل توڑا جس سے خدا نے آدم اور اسکی بیوی کو منع فرمایا تھا۔ الخ جب دونوں نے کھا لیا تو اللہ نے حوا سے کہا "اے حوا، تو نے میرے بندہ کو فریب دیا تو کسی حمل کے ساتھ حاملہ نہیں ہوگی مگر دوران حمل میں بھی تجھے تکلیف ہوا کرے گی اور جب وضع حمل کا وقت آئیگا تو بار بار موت کے قریب ہو ہو جائیگی"۔ اور سانپ سے کہا "تو ہی وہ جانور ہے جس کے پیٹ میں وہ ملعون داخل ہو کر جنت میں آیا اور میرے بندہ کو اس نے فریب دیا۔ تجھ پر ایسی پھٹکار برسائی جائے گی کہ تیرے پاؤں تیرے پیٹ کے اندر چلے جائیں گے اور تیرا رزق سوائے مٹی کے اور کچھ نہیں ہوگا"۔ ابن عباسؓ سے بھی اسی قسم کا قصہ نقل کیا گیا ہے[2]۔ ان آیات پر طبری کی تفسیر پڑھو تو وضاحت کے ساتھ یہ چیز منکشف ہو جائیگی کہ جو کچھ تورات اور اس کی شروح میں مذکور تھا وہ سب کچھ لے لیا گیا ہے ساتھ ہی وہ خبریں بھی لے لی گئی ہیں جو تورات کے ساتھ دوسری کتابوں میں روایت کی جاتی تھیں اور ان سب کو قرآن کریم کی آیات کی تفسیر بنا دیا گیا ہے۔ یہ لوگ کبھی ان اخبار کو وہب بن منبہ سے نقل کرتے ہیں کبھی عن اسرائیل عن اسباط اور عن سدی کی سند سے نقل کرتے ہیں یہی حال ان تمام قصوں کا ہے جو تورات میں آ گئے ہیں مصیبت یہ ہے کہ یہ یہودی جن سے ہمارے مفسرین نقل کرتے ہیں یہودیت کے مدقق عالم بھی نہیں تھے بلکہ ان کے عام لوگ تھے چنانچہ ابن خلدون نے کہا ہے کہ "یہ لوگ اہل کتاب کے عامی انسان تھے مفسرین نے ان روایات کے نقل کرنے میں تساہل سے کام لیا اور ان منقولات سے اپنی تفسیروں کو بھر دیا"[3]۔ یہ اسرائیلیات دن بدن بڑھتی ہی چلی گئیں حتیٰ کہ کتابیں ان سے پر ہو گئیں جیسے ثعلبی کی قصص الانبیاء وغیرہ۔

---

[1] اس میں نام اور مقام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ قصہ آدم درحقیقت خود انسان کی سرگزشت ہے۔ تفصیل کیلئے دیکھئے "ابلیس و آدم" (طلوع اسلام)

[2] تفسیر طبری ج ۱ ص ۱۸۶ اور مابعد۔ جاحظ نے کتاب الحیوان ج ۴ ص ۱۰۶ میں کعب احبار سے نقل کیا ہے کہ تورات میں ہے کہ حوا کو دس سزائیں دی گئیں آدم کو بھی دس سزائیں دی گئیں اور سانپ کو بھی دس سزائیں دی گئیں۔ پھر ان تمام سزاؤں کو بیان کیا ہے۔ جاحظ نے اس روایت میں شک کیا ہے کیونکہ یہ روایت توریت میں موجود نہیں ہے تاہم اگر کعب سے اس روایت کا نقل کرنا صحیح ہو تو تورات سے مراد یہودیوں کی تمام دوسری کتابیں ہو سکتی ہیں۔ [3] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۶۶۔

مسلمانوں نے بنی اسرائیل اور ان کے انبیاء کی تاریخ اپنے ہاں نقل کی جیسا کہ طبری نے اپنی تاریخ اور ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "معارف" میں کیا ہے علم و بصیرت نے ثابت کر دیا ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں سے جو کچھ نقل کیا گیا تھا اس کا اکثر حصہ غلط ہے۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جو کچھ نقل کیا گیا تھا وہ وہی کچھ تھا جو یہودی عوام نقل کرتے تھے۔ ابن قتیبہ اکثر موقعوں پر وہب بن منبہ کی روایت اور تورات کے بیانات میں مقابلہ کر کے خود بتا دیتے ہیں کہ دونوں میں کس قدر اختلاف ہے۔

بعض اسلامی مذاہب (فرقوں) پر یہودیت کی تاثیرات کچھ کم نہیں تھیں۔ ابن الاثیر نے احمد بن ابی دواد پر کلام کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ معتزلہ کے خلق قرآن وغیرہ عقائد کی طرف دعوت دینے والا یہی شخص تھا۔ اس نے یہ عقائد بشر مریسی سے لئے تھے اور بشر نے جہم بن صفوان سے اور جہم نے جعد بن درہم سے اور جعد نے ابان بن سمعان سے اور ابان نے طالوت سے جو لبید بن اعصم کا بھانجا اور داماد تھا اور طالوت نے لبید بن اعصم یہودی سے یہ تمام عقائد لئے تھے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے رسول اللہ صلعم پر جادو بھی کیا تھا[1]۔ لبید تورات کے مخلوق ہونے کا مدعی تھا اس موضوع پر جس شخص نے سب سے پہلے کتاب تصنیف کی وہ طالوت تھا جو زندیق تھا اور اس نے زندقہ کو پھیلایا۔[2]

العقد الفرید کے مصنف نے شعبی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے مالک بن معاویہ سے فرمایا "میں گمراہ کن خواہشات سے تمہیں ڈراتا ہوں جن میں سے بدترین فرقہ رافضیوں کا ہے جو دراصل اس امت کے یہودی ہیں۔ یہ لوگ اسلام سے ایسا ہی بغض رکھتے ہیں جیسا کہ یہودی قوم نصرانیت سے۔ یہ لوگ اسلام میں نہ شوق سے داخل ہوسکے نہ خوف سے بلکہ مسلمانوں کے ساتھ بغض رکھتے اور ان پر ستم ڈھانے کیلئے انھوں نے اسلام کا جامہ پہنا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں حضرت علیؓ نے آگ میں جلا دیا تھا۔ چنانچہ رافضیوں سے محبت رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ یہودیوں سے محبت رکھنا ـــــ یہودیوں نے کہا کہ حکومت آل داؤد ہی کا حصہ ہے۔ رافضیوں نے کہا کہ خلافت آل علیؓ بن ابی طالب ہی کا حق ہے ـــــ یہودیوں نے کہا کہ اللہ کے راستہ میں جہاد اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک مسیح منتظر کا خروج نہ ہو جائے اور آسمان سے ایک پکارنے والا نہ پکار دے کہ اس کے ساتھ ہو کر جہاد کرو ـــــ رافضیوں نے کہا کہ اللہ کے راستے میں جہاد اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مہدی منتظر کا خروج نہ ہو جائے جو آسمان سے ایک زینہ کے ذریعہ اتریگا ـــــ یہودی مغرب کی نماز میں تاخیر کرتے ہیں حتیٰ کہ ستارے اچھی طرح نکل آئیں۔ یہی کچھ رافضی کرتے ہیں ـــــ یہودیوں کے نزدیک تین طلاقوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہی کچھ رافضی کہتے ہیں ـــــ یہودی عورتوں پر عدت ضروری نہیں سمجھتے۔ یہی کچھ رافضیوں کا خیال بھی ہے ـــــ یہودی ہر مسلمان کے خون بہانے کو حلال سمجھتے ہیں، رافضیوں کا بھی یہی حال ہے ـــــ یہودیوں نے تورات میں تحریف کی ہے ایسے ہی رافضی بھی قرآن میں تحریف کے قائل ہیں ـــــ یہودی جبریل علیہ السلام کی تنقیص کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فرشتوں میں سے وہ ہمارا دشمن ہے، ایسے ہی رافضی کہتے ہیں کہ جبریلؑ نے غلطی کی کہ علیؓ ابن ابیطالب کو چھوڑ کر محمدؐ کے پاس وحی لیگیا ـــــ یہودی اونٹ کا گوشت نہیں کھاتے ایسے ہی رافضی بھی نہیں کھاتے الخ۔[3]

یہودیوں کو بہت سے مسائل پیش آئے جن میں انھوں نے بحث و تدقیق سے کام لیا اور اختلاف کیا تھا، چنانچہ مسئلہ نسخ کے بارہ میں انھوں نے بحث کی اور کہا کہ شریعت ایک ہی ہو سکتی ہے جو موسیٰؑ کے ساتھ شروع ہوئی اور انہی کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ لہٰذا نسخ جائز نہیں کیونکہ اوامر و احکام

---

[1] یہ قرآن اور رسول اللہ کی شانِ اقدس کے خلاف افسانہ طرازی صحاح (کتبِ احادیث) میں موجود ہے۔ (طلوع اسلام)

[2] ابن الاثیر ج ۷، ص ۲۶۔ [3] العقد الفرید ج ۱ ص ۲۶۹۔

میں نسخ کا ہونا بداء[1] ہے اور خدا کے متعلق بداء کا تصور کرنا جائز نہیں۔

انھوں نے تشبیہ کے بارہ میں بھی گفتگو کی ہے کیونکہ تورات ایسے الفاظ سے بھری پڑی تھی جن سے تشبیہ کا تصور ہوتا تھا۔ جیسے صورت، مشافہہ، بلند آواز سے گفتگو، طورِ سینا پر نزول، عرش پر استواء، رویت الٰہیہ کا جواز وغیرہ۔

رجعت کے بھی وہ قائل تھے یعنی بعض افراد کے مرجانے کے بعد زندہ ہو کر واپس آنے کے وہ قائل تھے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ عزیر کو اللہ تعالیٰ نے سو سال تک کیلئے موت دیدی تھی پھر انھیں زندہ کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ عزیر اب مرچکے ہیں مگر وہ پھر واپس آئیں گے۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ غائب ہو چکے ہیں مگر دوبارہ واپس آجائیں گے[2]۔

یہ تمام اقوال اور اختلافات یہودی نو مسلموں کے ذریعہ سے مسلمانوں میں بھی نامعلوم طریقہ پر داخل ہوتے چلے گئے۔ ہم مسلمانوں کو بھی دیکھتے ہیں کہ وہ خود قرآن میں جوازِ نسخ کے مسئلہ پر بحث کرتے ہیں جیسا کہ یہودیوں نے تورات میں جوازِ نسخ پر بحثیں کی تھیں، چنانچہ جمہور مسلمان اس طرف چلے گئے ہیں کہ نص کا تو نہیں البتہ حکم کا منسوخ ہو جانا جائز ہے۔ اور یہ کہ ایسا نسخ قرآن میں ہوا بھی ہے لیکن ابو مسلم اصفہانی اس کے مخالف ہیں ــــ ہم اصولِ فقہ کی کتابوں میں مسلمانوں کو دیکھتے ہیں ــــ کہ جب وہ مسئلۂ نسخ پر کلام کرتے ہیں تو ــــ یہودیوں سے ان کی رائے پر مناقشے مجادلے اور تردیدیں کرتے ہیں[3]۔ جس چیز سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ یہودی ہی اس مسئلہ کو پھیلانے کا سبب تھے، یہ ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بعض شیعہ اس بداء کے قائل ہیں جس کے یہودی منکر ہیں۔ سب سے پہلے جس نے اس قول کو اختیار کیا وہ مختار بن عبید تھا جو محمد بن الحنفیہ کا داعی تھا۔ شہرستانی نے کہا کہ مختار بداء کا اس لئے قائل ہوا کہ وہ آئندہ ہونے والے حالات و حوادث کے علم کا مدعی تھا اور کہتا تھا کہ یا تو اسے وحی کے ذریعہ وہ حالات معلوم ہو جاتے ہیں یا امام کی طرف سے پیغام کے ذریعے سے۔ جب وہ اپنے اصحاب سے کسی امر کے ہونے اور کسی حادثہ کے پیدا ہونے کا وعدہ کرتا تھا ــــ اگر اس حادثہ کا وقوع اس کے قول کے مطابق پڑ جاتا تھا تو وہ اسے اپنے دعوے کی سچائی کی دلیل بنا لیتا تھا۔ اور اگر موافق نہیں پڑتا تھا تو کہہ دیتا تھا کہ تمہارے رب کی رائے تبدیل ہو گئی ــــ وہ بداء اور نسخ میں کوئی فرق نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا جب احکام میں نسخ ہو سکتا تھا تو واقعات میں بداء بھی ہو سکتا تھا[4]۔ چنانچہ شیعوں کے اکثر فرقوں نے بداء کے مسلک کو قبول کر کے اپنے بہت سے تاریخی مسائل میں اسی سے تطبیق دی ہے۔ حتیٰ کہ ان کے ایک امام کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ خدا کی عبادت اس سے بہتر طریقے پر نہیں ہو سکتی کہ بداء کے قول کا اعتراف کیا جائے کیونکہ اسی سے خدا سے معافی مانگنے میں توبہ کا دروازہ کھلتا ہے۔ یہودی مسئلہ بداء میں شیعوں کے قوی ترین مخالفین میں سے تھے۔

ایسے ہی مسلمانوں کی طرف تشبیہ کا مسئلہ بھی یہودیوں ہی سے منتقل ہوا جو ان میں پھیلا ہوا تھا اور بحث کا موضوع قرآن کی وہ آیات قرار دے لی گئیں جن سے اس کی طرف اشارہ نکلتا تھا۔ مثلاً ید اللہ فوق ایدیھم (خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے) الرحمٰن علی العرش استویٰ (خدائے رحمٰن عرش پر مستوی ہو گیا) اور ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام (تیرے رب

---

[1] بداء کا مطلب یہ ہے کہ خدا پہلے ایک کام کرنے کا ارادہ کرے اس کے مطابق فیصلہ بھی کر دے لیکن بعد میں اس فیصلہ میں تبدیلی کر دے (طلوعِ اسلام)۔

[2] ان تمام اقوال کو شہرستانی نے یہود سے الملل والنحل ص ۸۵-۸۹ میں نقل کیا ہے۔ [3] اصول ابن حاجب ج ۲ ص ۱۸۸ ملاحظہ کیجئے۔

[4] شہرستانی ص ۵۵ کلمہ بداء، بدالہٗ سے مشتق ہے یعنی اس کی رائے یوں تبدیل ہو گئی۔

صاحب جلالت واکرام ہی کا چہرہ باقی رہ جائے گا) ایسے ہی حدیث میں آتا ہے کہ "مومن کا دل رحمٰن کی انگلیوں میں دو انگلیوں کے درمیان رہتا ہے" اس قسم کی آیات واحادیث کے بارے میں مسلمانوں میں مختلف گروہ ہوگئے۔ سلف میں سے کچھ لوگوں نے تو کہا کہ ہم ان آیات پر ایمان لاتے ہیں مگر ان کا مطلب کیا ہے اس سے تعرض نہیں کرتے کیونکہ ہمیں یہ قطعی طور پر معلوم ہے کہ خدا اپنی مخلوقات میں سے کسی چیز کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتا۔ لیکن بعض غالی شیعہ کی ایک جماعت اور خود محدثین میں سے ایک جماعت (جو حشویہ کے نام سے پکاری جاتی ہے) تشبیہ کی قائل ہوگئی۔ انھوں نے یہاں تک کہدیا کہ خدا کے لئے منتقل ہونا، اترنا، چڑھنا اور استقرار پکڑنا سب باتیں جائز ہیں۔ انھوں نے اختلاف میں بھی اسی اختلاف کی پیروی کی ہے جو یہودیوں میں تھا۔ شہرستانیؒ ــــ فرقۂ مشبہہ پر کلام کرتے ہوئے ــــ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے ان احادیث کو جو اس بارہ میں وارد ہوئی ہیں متعارف صفات اجسام پر چسپاں کیا ہے اور احادیث میں بہت سی جھوٹی حدیثیں خود گھڑ گھڑ کر ملا دیں اور نبی علیہ السلام کی طرف ان کو منسوب کر دیا حالانکہ یہ اکثر حدیثیں یہودیوں ہی سے ماخوذ ہیں کیونکہ ان کے ہاں تشبیہ کا مسئلہ طبعی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ تو خدا کے بارے میں یہاں تک قائل ہیں کہ "اللہ میاں کی آنکھیں آشوب کر آئیں تو فرشتے مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوئے" ــــ طوفان نوحؑ کے حادثہ پر اللہ میاں اسقدر روئے کہ آنکھیں آشوب کر آئیں" ــــ "خدا کے نیچے عرش الٰہی اس طرح چرچراتا ہے جیسے سوار کے نیچے نیا کجاوہ چرچراتا ہے" ــــ (یہ تو تورات کا بیان تھا) مشبہہ فرقہ نے (مسلمانوں میں سے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا "میرا پروردگار مجھ سے ملا تو اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور گلے لگا لیا۔ اپنا ہاتھ میرے کندھوں کے درمیان رکھا تو مجھے اس کی انگلیوں کی ٹھنڈک سینہ تک محسوس ہوئی"[1] شہرستانی، دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ "تشبیہ کا عقیدہ تمام یہودیوں میں نہیں تھا، خاص خاص یہودیوں میں تھا بلکہ خصوصیت سے قرائین میں تھا، کیونکہ تورات میں انھیں بہت سے ایسے الفاظ ملتے تھے جو تشبیہ پر دلالت کرتے تھے"[2]

شیعوں نے ــــ رجعت کے بارہ میں ــــ وہی کچھ کہا ہے جو یہودیوں نے کہا تھا۔ یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ موجود تھا کہ ــــ الیاس نبیؑ آسمان پر چڑھ گئے تھے اور وہ عنقریب واپس آکر دین اور قانون کو نافذ کریں گے ــــ جیسا کہ ابن حزم نے نقل کیا ہے ــــ جب حضرت علیؓ شہید کر دیئے گئے تو ابن سبا یہودی نے کہا کہ "اگر تم ہزار مرتبہ ان کا سر ہمارے سامنے لاکر رکھدو تب بھی ہم ان کی موت کی تصدیق نہیں کریں گے۔ وہ اس وقت تک نہیں مر سکتے جب تک زمین کو ایسا ہی عدل وانصاف سے پُر نہ کر دیں جیسا کہ آجکل وہ ظلم وجور سے بھری گئی ہے"۔ یہ فکر شیعوں میں درجۂ کمال تک پہنچ گئی چنانچہ انھوں نے یہی کچھ ان اماموں کے بارے میں کہنا شروع کر دیا جو نگاہوں سے مستور ہوگئے تھے۔ پھر یہی کچھ مہدی منتظر کے بارے میں وہ کہنے لگے۔

اس سے ہمیں نظر آجاتا ہے کہ اکثر کلامی مسائل وغیرہ کا سرچشمہ یہودی ہی تھے۔ اور یہ مسائل جس طرح ان کے ہاں رائج تھے ایسے ہی مسلمانوں میں رائج ہوتے چلے گئے اور رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد حق ثابت ہو کر رہا کہ ــــ "تم لوگ اپنے سے پہلوں کی بالشت ببالشت اور ذراع بذراع پیروی کرکے رہو گے حتیٰ کہ اگر وہ کبھی گوہ (ضب) کے سوراخ میں داخل ہوئے ہوں گے تو تم بھی اس میں گھس کر رہو گے"۔ صحابہ نے سوال کیا "اے اللہ کے رسول! کیا ہم یہود ونصاریٰ کی پیروی کریں گے"۔ تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ "اور کس کی؟"

---

[1] شہرستانی ص ۳۷-۳۸۔ [2] شہرستانی ج ۲ ص ۳۱۔

عقائد کے بارے میں کلام کرنے والے بعض لوگ یہودی الاصل تھے مثلاً بشر مریسی جو بہت سی ایسی آراء کا قائل ہے جن میں وہ منفرد ہے لوگ اسے ان آراء کی بنا پر بہت ناپسند کرتے تھے اور قریب تھا کہ قتل کر ڈالیں۔ یہی شخص خلق قرآن کے قائلین میں سے مشہور ترین ہستی ہے۔

ابن قتیبہ نے بیان کیا ہے کہ ہارون الاعور، جو قراء میں سے ایک قاری ہے، یہودی تھا جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔ اصمعی نے نقل کیا ہے کہ ہارون کہا کرتا تھا کہ میں آدم کو ایں الف پڑھا کرتا تھا جو عبرانی لفظ ہے۔

ادبی کتابوں میں بہت سے یہودی نصائح داخل ہو گئے جو ان کے انبیاء اور صلحا سے منقول ہیں۔ مثلاً شعیاء نبی کا یہ قول کہ انھوں نے بنی اسرائیل سے کہا کہ ــــ چوپائے سے جسقدر زیادہ محنت کرائی جاتی ہے وہ اتنا ہی نرم ہوتا جاتا ہے لیکن تمہارے دل جسقدر زیادہ تمہیں نصیحت کی جاتی ہے اور سخت ہوتے جاتے ہیں"۔ جسم جب صالح ہوتا ہے تو اسے تھوڑا سا کھانا بھی کافی ہو جاتا ہے اور دل جب صالح ہوتا ہے تو اسے تھوڑی سی نصیحت بھی کارگر ہو جاتی ہے ــــ کتنے چراغ ہوں گے جنھیں ہوا نے گل کر دیا ہو گا اور کتنے عبادت گذار ہوں گے جنھیں عجب اور خود پسندی نے برباد کر دیا ہو گا ــــ اے بنی اسرائیل! میری بات سنو، کیونکہ حکمت کی بات کو کہنے والا اور سننے والا دونوں شریک ہوتے ہیں اور اس حکمت کا مستحق ترین وہ شخص ہوتا ہے جو اس پر عمل کر کے اسے سچ کر دکھائے [1]

بعض محققین ــــ جیسے استاذ شوقان ــــ نے کہا ہے کہ الف لیلہ و لیلہ کے بعض قصے بھی یہودی اصل سے ماخوذ ہیں۔

بہر حال، اسلامی مملکت میں یہودی ثقافت موجود تھی۔ بعض چیزیں علمی اعتبار سے صحیح تھیں اور بعض غلط تھیں ــــ بعض چیزیں اہل کتاب کے علماء سے لی گئیں اور بعض عام یہودیوں سے لی گئیں ــــ دونوں قسم کی چیزیں کثرت کے ساتھ مسلمانوں میں نفوذ کر گئیں یہودی اور مسلمان آپس میں مباحثے کرتے تھے۔ ہر فرقہ اپنے دین کی طرف دعوت دیتا اور اپنے دین کی حقانیت پر دلائل قائم کرتا تھا۔ کتابوں میں اس قسم کے مباحثے کثرت سے منقول ہیں۔ ان میں سے قدیم ترین وہ مباحثہ ہے جو اس سے منقول ہے (یہ بنو قریظہ میں سے تھا) اس کی بیوی مسلمان ہو گئی تھی اور اس کو اسلام کی دعوت دیتی تھی۔ اس نے انکار کرتے ہوئے کہا تھا:

> جس دن میں اس سے ملا میری بیوی نے مجھے اسلام کی دعوت دی۔ میں نے کہا، نہیں، بلکہ آؤ ہی یہودی ہو جا ہم تو موسیٰؑ کی تورات اور اس کے دین پر قائم ہیں ــــ اور میری جان کی قسم یہ دین ــــ یعنی دین محمدؐ ــــ یہ بھی اچھا دین ہے ہم میں سے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ رشد و ہدایت اس کے دین میں ہے۔ جسے رشد کے دروازوں کی طرف راہنمائی مل جاتی ہے وہ رشد و ہدایت کو پا لیتا ہے۔

ایسے ہی صفدی نے اپنی کتاب "غیث" میں ایک یہودی اور ایک مسلمان (جو عقیدۂ جبر کا قائل تھا) کا مباحثہ نقل کیا ہے [2]۔ یہ تمام مناظرے اور مباحثے ہر فریق کو مجبور کرتے تھے کہ اپنے مقابل کے دین کے متعلق کافی معلومات بہم پہنچائے تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنی حجت قائم کر سکے اور مقابل کی حجت کی مدافعت کر سکے۔ دونوں ثقافتوں کے پھیلنے کا یہی سبب تھا۔

---

[1] عقد الفرید ج ۱ ص ۳۵۶ اس میں اس طرح کی اور بھی بہت سی نصائح ہیں۔ [2] ج ۲ ص ۷۳۔

نصرانیت

اسی طرح قرآن میں ایسی آیات بھی موجود ہیں جو انجیل کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور اس کو اللہ کی سماوی کتابوں میں سے ایک کتاب شمار کرتی ہیں۔ ثم قفینا علیٰ اٰثارھم برسلنا وقفینا بعیسی ابن مریم واتیناہ الانجیل۔ اور اذ قال اللہ یعیسی ابن مریم اذکر نعمتی علیک وعلیٰ والدتک اذ ایدتک بروح القدس تکلم الناس فی المھد و کھلا، اذ علمتک الکتاب والحکمت والتوراۃ والانجیل — اور — ولیحکم اھل الانجیل بما انزل اللہ فیہ الخ مسلمانوں کا موقف اور اختلاف انجیل کے مقابلہ میں (اس کی صحت اور تحریف کے بارہ میں) وہی تھا جو تورات کے بارہ میں تھا۔ بلکہ ابن حزم اور ابن تیمیہ وغیرہ نے اس انجیل کا جو ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے قطعاً انکار کیا ہے اور توراۃ کے بارہ میں جتنا کچھ کہا گیا تھا اس سے کہیں زیادہ تر کہا گیا ہے[1]

بہرحال نصرانیت کی بھی ایک دینی ثقافت تھی جس کی اہم بنیاد انجیل تھی اور اس کی شروح اور دیگر قصص واخبار۔ یہ سارا کچھ مختلف طریقوں سے غیر محسوس طور پر مسلمانوں میں سرایت کرتا چلا گیا۔ ان میں اہم ترین ذریعہ خود نصاریٰ عرب تھے۔ کیونکہ نصرانیت عرب کے بعض قبائل میں پھیل چکی تھی۔ خصوصاً بنو تغلب اور بنو نجران وغیرہ قبائل میں۔ اسی طرح بہت سے نصرانی مسلمان ہو گئے تھے۔ مختلف اطراف میں ان کے اثرات ہمیں محسوس ہوتے ہیں۔ سب سے مقدم تو قرآن کی تفسیر ہے۔

قرآن کریم نے ان بعض مسائل سے تعرض کیا ہے جو خود انجیل میں بھی موجود تھے جیسے عیسیٰ اور مریم علیہما السلام کا قصہ۔ عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات وغیرہ۔ قرآن کا اسلوب — جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں — ایک مختصر اسلوب ہے جو واقعہ کے ان ٹکڑوں پر اقتصار کرتا ہے جن کا تعلق موعظت سے ہو — اب مفسرین آئے تو انھوں نے مسلمان ہو جانے والے یہود و نصاریٰ سے ان آیات کی شروح اور تفصیلات نقل کرنی شروع کر دیں۔ طبری میں سورۂ مریم کی تفسیر ذرا پڑھ کر دیکھو۔ تم دیکھو گے کہ وہ بہت سی شرحیں انجیل اور اس کی شروح سے نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ نہ صرف انجیل اور اس کی شروح سے بلکہ ان تمام کتابوں سے بھی جو انجیل کے ساتھ بعد میں گھڑ لی گئی تھیں۔ یہ تمام باتیں وہ وہب بن منبہ، اسباط، ابن جریج، زکریا بن یحییٰ، ابن زائدہ سے نقل کرتے ہیں۔ اسی طرح ان آیات کی تفسیر ذرا پڑھ کر دیکھو — جو سورۂ آل عمران میں ہیں — اور عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کی تعداد سے جن کا تعلق ہے — ورسولا الیٰ بنی اسرائیل قد جئتکم بایۃ من ربکم انی اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیرا باذن اللہ الآیہ۔ اب ابن جریج آتے ہیں اور طیر کی تفسیر خفاش سے کر جاتے ہیں۔ طبری ابن حمید سے عن سلمۃ عن ابی اسحٰق، اس کی کیفیت کے بیان میں ایک قصہ بیان کر جاتے ہیں[2]۔ یہ چیزیں بعد میں بڑھتی چلی گئیں حتیٰ کہ زکریا، یحییٰ بن زکریا، مریم، عیسیٰ علیہم السلام، حواریین، حدیث مائدہ سے متعلق کتاب قصص الانبیاء ثعلبی وغیرہ میں طویل طویل قصے ہمیں نظر آتے ہیں۔

ان مسلمان ہو جانے والے نصاریٰ نے انجیل کے بہت سے اقوال اسلام میں یہ کہہ کر ٹھونس دیئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں۔

---

[1] الملل والنحل کی فصل ملاحظہ فرمائیے اور الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح لابن تیمیہ کا مطالعہ کیجئے۔ [2] طبری ج ۳ ص ۱۹۰ دیکھئے۔

استاد گولڈزیہر (گولڈزیہر) نے ان حدیثوں کا نمونہ پیش کیا ہے جو نصرانیت کے ذریعہ سے مسلمانوں کی کتب احادیث میں داخل ہو گئیں مثلاً یہ حدیث کہ ــــ "ایک وہ آدمی ہوتا ہے جو خفیہ طور پر صدقہ کرتا ہے حتیٰ کہ اس کے بائیں ہاتھ کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا دایاں ہاتھ کیا خرچ کر رہا ہے"۔ اور یہ حدیث کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ــــ "تم لوگ میرے بعد ترجیحی سلوک دیکھو گے اور ایسی باتیں پاؤ گے جو تمہیں اجنبی کی معلوم ہوں گی۔ صحابہؓ نے عرض کیا ــــ تو اے رسول اللہؐ! آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں ــــ آپ نے فرمایا۔ سلاطین کو ان کا حق ادا کرتے رہنا اور اللہ سے اپنا حق مانگتے رہنا" ــــ ایسے ہی اغنیاء پر فقراء کی فضیلت میں مبالغہ آرائی سے متعلق حدیثیں۔ کیونکہ یہ خالص نصرانی نظریۂ زندگی ہے۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ میری امت کے فقراء جنت میں مالداروں کی بہ نسبت پانچ سو سال پہلے داخل ہو جائیں گے ــــ اور مثلاً یہ حدیث کہ "کبوتروں کی طرح سیدھے اور بھولے بن کر رہو"۔ بالکل اسی طرح کا مضمون متی کی انجیل میں موجود ہے کہ ــــ اب میں تمہیں بھیڑیوں کے درمیان بھیج رہا ہوں۔ لہٰذا تم سانپ کی طرح عقلمند اور کبوتروں کی طرح بھولے بھالے بن جاؤ ــــ ایسے ہی ابوداؤد کی وہ حدیث جو ابودرداءؓ سے منقول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو فرماتے ہوئے سنا آپ فرماتے تھے کہ تم میں سے کسی کو اگر کوئی شکایت ہو یا اس کے بھائی کو کوئی شکایت ہو تو یہ دعا پڑھ لیا کرے "ربنا اللہ الذی فی السماء تقدس اسمك، امرك فی السماء والارض، كما رحمتك فی السماء فاجعل رحمتك فی الارض، اغفر لنا حوبنا وخطايانا، انت رب الطيبين، انزل رحمة من رحمتك وشفاء من شفائك على هذا الوجع" تو وہ شکایت اور درد جاتا رہے گا۔ اس میں کوئی شبہ ہی نہیں کہ یہ مشہور نصرانی دعا ہے۔ (جو حدیثوں میں ٹھونس دی گئی ہے)۔

ہمیں استاد گولڈزیہر سے اس باب میں پورا پورا اتفاق ہے کہ بعض نصرانی اقوال یقیناً احادیث میں داخل کر دیئے گئے، اور رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب کر دیئے گئے ہیں لیکن ہم ان کی تمام باتوں سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ مثلاً فقیر کی بزرگی اور عظمت کو بیان کرنا خالص نصرانی نظریہ نہیں ہے بلکہ تمام الٰہی ادیان ــــ یہودیت، نصرانیت اور اسلام ــــ کا یہی نظریہ[1] ہے۔ اور یہ نظریہ ہونا بالکل طبیعی ہے ــــ ان تمام ادیان کے ارکان میں سے یہ چیز ہے کہ ــــ مقیاسِ فضیلت عملِ صالح ہے۔ مال نہیں ہے ــــ تمام ادیان انسانوں کے اس مانوس مقیاس کو منہدم کرتے ہیں کہ انسان کی عظمت کا اندازہ مالداری سے لگایا جائے۔ دین کا نظریہ یہ ہے کہ عمل صالح کی اپنی ذاتی قیمت ہوتی ہے خواہ وہ کوئی مالدار کرے یا فقیر آدمی کرے۔ یہ امر بھی طبیعی ہے کہ فقیر کے بعض اعمال ــــ مثلاً مالی اعمال خیر ــــ افضل ہوتے ہیں ــــ کیونکہ فقیر آدمی کا کوئی قربانی دینا بڑی چیز ہے۔ لہٰذا انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا ثواب بھی بڑا ہو۔ محمد رسول اللہ صلعم نے مالدار بننے سے احتراز برتا اور کبھی مالدار بننا نہیں چاہا حالانکہ آپ کے لئے مالدار بن جانا قطعاً ممکن تھا۔ خود قرآن میں ایسی آیتیں موجود ہیں جن سے فقراء صالحین کی عظمت و بزرگی[2] معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً "للفقراء المهاجرين الذين اخرجوا من ديارهم واموالهم"

---

[1] ہمیں مصنف کے اس بیان سے اتفاق نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مدار فضیلت عمل صالح ہے دولت نہیں۔ مگر مدار فضیلت جبکہ دولت نہیں ہے اسی طرح فقیری بھی نہیں ہے۔ لوگ مالداری کو مدار فضیلت سمجھتے تھے تو اس کی تردید کرنی چاہیے۔ لیکن اس کی تردید یہ نہیں ہو سکتی کہ فقیری کو مدار فضیلت قرار دیدیا جائے۔ فقیری کو مدار فضیلت قرار دینا خالص نصرانی نظریہ ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا استاد گولڈزیہر کا بیان اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے۔ (طلوع اسلام)

[2] یہ قرآن پر تہمت ہے۔ صالحین کی بزرگی سے کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن قرآن کی رو سے فقر و محتاجی کی زندگی خدا کا عذاب ہے۔ جو آیات مصنف نے درج کی ہیں ان میں صرف اس قدر ذکر ہے کہ جو مہاجرین (REFUGEES) مکہ سے آ رہے ہیں وہ اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ کر آ رہے ہیں لہٰذا ان کی ضروریات کا خیال رکھنا مقدم ہے۔ یا جو مسلمان دشمنوں میں گھر چکے ہیں اور اس طرح باہر کی مدد کے محتاج ہو چکے ہیں ان کی امداد بھی مقدم ہے۔ یہ آیات محتاجی کی فضیلت نہیں بیان کرتیں۔ (طلوع اسلام)۔

اور "للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضرباً فی الارض"۔ لہٰذا فقر کی مدح سرائی میں اسلام اور نصرانیت کا اتحاد اس چیز پر دلالت نہیں کرتا کہ یہ چیز اسلام نے نصرانیت سے لی ہے۔ لوگوں کا بیان یہ بھی ہے کہ عربی معاشرہ مالداری کو فقیری پر فضیلت دیتا تھا چنانچہ عروۃ الورد کا قول ہے:

دعینی للغنیٰ اسعیٰ فانی رأیت الناس شرھم الفقیر

(مجھے مالداری حاصل کرنے کیلئے تو کوشش کرنے دے کیونکہ میں نے لوگوں کو دیکھا ہے کہ ان میں بدترین آدمی فقیر ہی ہوتا ہے۔)

لیکن اس کے مقابلہ میں ایک دوسرے عربی شاعر قیس بن حطیم کا یہ قول بھی تو موجود ہے:

غنی النفس ما عمرت غنی وفقر النفس ما عمرت شقاءُ

(دل کا غنی جب تک بھی زندہ رہے غنی ہی رہتا ہے اور دل کی فقیری جب تک ساتھ رہے بدبختی ہی رہتی ہے)

لیکن دلیل میں نہ یہ شعر پیش کیا جاسکتا ہے نہ وہ شعر۔ ہم اسلام کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ اسلام کا حکم تو وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا کہ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ، ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔ (جو شخص ذرہ برابر نیکی کریگا وہ اسے دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا وہ اسے دیکھ لیگا) اور ما اغنیٰ عنہ مالہ وما کسب (اس کا مال اور جو کچھ اس نے حاصل کیا ہوگا وہ اسے کچھ بھی کام نہ آئے گا)۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نصرانیت اور یہودیت میں بہت زیادہ اخبار و قصص نقل کئے گئے ہیں جن میں فقراء کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور مسلمانوں نے انھیں اپنی کتابوں میں جگہ دے لی۔ مثلاً احیاء العلوم[1] میں یہ روایت ہے کہ مسیح علیہ السلام اپنی سیاحت میں ایک سوئے ہوئے شخص پر گذرے جو ایک عبا میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔ حضرت مسیحؑ نے اس کو جگایا اور فرمایا اے سونے والے اٹھو اور خدا کو یاد کرو۔ اس آدمی نے جواب دیا کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ میں نے تو دنیا کو دنیا والوں کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ اس پر مسیحؑ علیہ السلام نے فرمایا۔ اگر ایسا ہے تو تم سو سکتے ہو۔" ایسے ہی موسیٰ علیہ السلام ایک سوتے آدمی پر گذرے جو مٹی پر ایک اینٹ کا تکیہ لگائے سو رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور ڈاڑھی مٹی میں بھر چکی تھی۔ یہ شخص ایک عبا پہنے ہوئے تھا اسے دیکھکر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: پروردگار! تیرا یہ بندہ تو دنیا میں ضائع ہو جائے گا۔ تو خدا نے ان پر وحی بھیجی کہ اے موسیٰ جب میں اپنی پوری توجہات کسی بندہ کی طرف مبذول کرتا ہوں تو تمام دنیا اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتی ہے۔" ایسے ہی مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ "مالدار آدمی بمشکل جنت میں داخل ہو سکے گا"۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا بارالٰہا! تیری مخلوق میں تیرے محبوب بندے کون لوگ ہیں کہ میں ان سے تیری خاطر محبت کروں۔ خدا نے فرمایا کہ "ہر فقیر"[2]

ظاہر ہے کہ اس قسم کی روایات نے مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کو ایک خاص رنگ دیدیا۔ اسلام دراصل زندگی میں عمل کی دعوت دیتا تھا اور رہبانیت کو پسند نہیں کرتا تھا اور عمل کرنے والے کا اندازہ اس کے عمل سے کرتا تھا خواہ وہ مالدار ہو یا فقیر۔ لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ اس قسم کی روایات جو احیاء العلوم وغیرہ میں نقل کی گئی ہیں ایک نئی فکر ابھارتی تھیں۔ وہ نئی فکر تھی مالداری سے بھاگنا

---

[1] احیاء العلوم (امام غزالیؒ کی مشہور کتاب) دینی اعتبار سے بہت ہی کمزور ہے۔ (طلوع اسلام) [2] احیاء العلوم ج ۴ ص ۱۵۲ وما بعدہا۔

عبادت کی محبت چاہے عبادت گذار آدمی دنیوی اعمال کو چھوڑ ہی کیوں نہ بیٹھے۔ یہ وہ فکر تھی جو رہبانیت سے زیادہ مشابہت رکھتی تھی جو اسلامی تاریخ کے دور اول میں بمشکل ہی کہیں نظر آسکتی تھی۔

ایک روایت میں ہے کہ اشعری قبیلہ کے کچھ رفقاء سفر میں تھے۔ انھوں نے سفر سے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کے بعد فلاں آدمی سے افضل اور کوئی نہیں ہوگا۔ وہ دن کو روزے رکھتا تھا۔ رات کو جب ہم منزل کرتے تھے تو صبح روانگی تک نفلیں پڑھتا رہتا تھا۔ آپ نے پوچھا کہ اس کا کام کون کرتا تھا اور اس کے کھانے وغیرہ کا انتظام کون کرتا تھا اس پر لوگوں نے عرض کیا کہ ہم سب ہی کرتے تھے تو آپ نے فرمایا کہ تم سب ہی اس سے افضل ہو۔

تاریخ میں مسلمان مورخین نے نصاریٰ کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ ان میں سب سے پہلے یعقوبی ہیں جنھوں نے اپنی تاریخ میں انجیل کے اقتباسات تک دیدیئے ہیں۔ طبری کی تاریخ میں بھی نصاریٰ کی تاریخ کا کافی حصہ موجود ہے۔ اس میں حواریوں کی ایک جماعت کے حالات ہیں۔ جرجیس کا واقعہ، یہ ـــــ جیسا کہ طبری کا بیان ہے ـــــ فلسطین کا ایک نیک بندہ تھا۔ اس نے عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں کچھ بچے کھچے لوگوں کو پایا تھا۔ غرض طبری نے اس کا طویل قصہ بیان کیا ہے۔ اس میں اصحاب کہف کے واقعات بھی ہیں۔ الخ۔ یہی کچھ مسعودی نے کیا۔ پھر جو کچھ لکھا ہے اس میں صحیح اخبار اور زبان زد قصوں کہانیوں، سب کو خلط ملط کر دیا ہے۔ اور جیسا کہ یہودیوں کی تاریخ میں کیا تھا وہی کچھ نصاریٰ کی تاریخ کے ساتھ کیا ہے۔

اس کے علاوہ جو کچھ ہم بیان کر چکے ہیں مسلمانوں اور نصاریٰ میں مذہبی مناظرات بھی ہوتے رہتے تھے۔ مسلمانوں نے شام اور عراق کے شہروں کو فتح کیا جو نصاریٰ سے بھرپور تھے۔ جب تلوار کی جنگ ختم ہوگئی تو زبان کی جنگ شروع ہوگئی[1] مسلمان ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے تھے اور اس کیلئے مجبور ہوتے تھے کہ اسلام کی حقانیت پر دلائل و براہین پیش کریں۔ ان کے بالمقابل رؤسا نصرانیت دلائل کا مقابلہ دلائل سے کرتے تھے، جس سے ایک بڑا مجادلہ قائم ہوگیا تھا۔ اسکی کثرت اموی دولت کے دوران میں ہوئی اور زیادہ تر شام ہی میں رہی کیونکہ دمشق دارالخلافہ تھا اور شام میں نصاریٰ کثیر تعداد میں تھے۔ کیونکہ مسلمانوں سے پہلے وہ رومی نصاریٰ کے ہاتھ میں رہ چکا تھا۔ پھر دمشق میں اموی خلفاء کے محلات میں بھی نصاریٰ کا عمل دخل تھا جو بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص یحییٰ دمشقی تھا جس کے متعلق بہت سی روایات منقول ہیں۔ یہ نصرانی تھا اور اپنی نصرانیت میں نہایت متشدد تھا۔ یہ اور اس کا باپ دونوں عبدالملک بن مروان کے محل میں ملازم تھے۔ یحییٰ نے نصرانیت کی تائید میں ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی جس میں وہ مسلمانوں کی دعوت کی عجیب انداز سے مخالفت کرتا ہے۔ اس کتاب میں اس قسم کی باتیں ملتی ہیں۔ جب کوئی عربی تم سے پوچھے کہ تم مسیح کے بارہ میں کیا کہتے ہو؟ تو تم جواب دو کہ "وہ اللہ کا کلمہ ہیں" اس کے بعد تمہیں خود مسلمان سے سوال کرنا چاہیئے کہ قرآن میں مسیح کو کس نام سے پکارا گیا ہے۔ تمہیں خود کچھ

---

[1] اور جو تلوار کی جنگ میں اس طرح فاتح و منصور نکلے تھے وہ زبان کی جنگ میں اس بری طرح سے مات کھا گئے کہ آج تک خمیازہ بھگت رہے ہیں اور طرفہ تماشا یہ کہ اپنی شکست کو فتح سمجھ رہے ہیں۔ یہ شکست یہ تھی کہ غیر شعوری طور پر فریق مقابل کے اعتقادات اور نظریات رفتہ رفتہ خود اسلام بن گئے۔ (طلوع اسلام)

نہیں کہنا چاہئے بلکہ مسلمانوں ہی سے پوچھنا چاہیے۔ بالآخر وہ مجبور ہو کر یہی کہیگا کہ مسیح "اللہ کا کلمہ ہیں جو اس نے مریم کی طرف ڈالا اور اس کی روح ہیں"۔ جب یہ عربی یہ کہدے تو تم اس سے پوچھو کہ اللہ کا کلمہ اور اس کی روح مخلوق ہوتی ہے یا غیر مخلوق؟ اگر وہ کہے کہ مخلوق ہوتی ہے تو تمہیں جواب دینا چاہئے کہ اس سے تو لازم آتا ہے کہ خدا کسی زمانہ میں ایسا بھی تھا کہ نہ اس کا کلمہ تھا نہ اس کی روح تھی۔ یحییٰ کہتا ہے کہ جب تم یہ کہوگے تو مسلمان ساکت و مبہوت رہ جائیگا۔ کیونکہ جو ایسا خیال کرتا ہے وہ مسلمانوں کی نظر میں زندیق ہوتا ہے"۔ مسلمانوں نے اس اعتراض کا جواب یہ دیا کہ کلمہ سے مراد یہ ہے کہ وہ بلا واسطہ اللہ کے کلمہ اور اس کے امر سے پیدا ہوئے تھے جیسا کہ قرآن ہی میں ہے "ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل ادم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون"۔ رہ گیا روح کا لفظ تو وہ رحمت کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ قرآن میں ہے وایدھم بروح منہ۔ . . . . . قرآن نے جبریل کو بھی روح کہا ہے اور ان کے بارہ میں کسی کا وہ قول نہیں ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق لوگوں نے کہا ہے۔ حق تعالیٰ نے آدمؑ کے بارہ میں بھی فرمایا ہے ونفخت فیہ من روحی جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں فرمایا ہے۔ خدا نے خود قرآن کریم کو بھی روح کہا ہے وکذلک اوحینا الیک من روحنا۔ لہذا یحییٰ دمشقی کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ کلمہ اور روح کے ظاہر لفظ کو دیکھکر انھوں نے اعتراض کردیا (اور یہ نہیں دیکھا کہ روح کا لفظ قرآن میں کن کن معانی میں استعمال ہوا ہے۔)

بہرحال نصاریٰ اور مسلمانوں میں اس قسم کے مناظرے بھی رہتے تھے جن کی وجہ سے ہر فریق دوسرے فریق کی کتابیں پڑھتا تھا اور اپنے دلائل مرتب کرنے میں ان سے مدد لیتا تھا۔

اسلامی فرقوں میں تعلیماتِ نصرانیہ کا پرتو ہمیں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ نصرانی کلیسا خلودِ عذاب کے مسئلے میں مناظرے کرتے رہے ہیں۔ کلیسائے یونان کے پادری عذاب نار کی ابدیت کے منکر ہیں[1]۔ تو مسلمانوں میں ہمیں جہم بن صفوان ملتے ہیں جو کہتے ہیں کہ جنت اور جہنم فنا ہو جائیں گی اور جنتی اور جہنمی بھی ان کے ساتھ ہی فنا ہو جائیں گے۔

استاذ فون کریمر کا رجحان اس طرف ہے کہ فرقہ معتزلہ نصرانیت سے پیدا ہوا ہے کیونکہ کلیساؤں کے پادری حریت ارادہ کے مسئلہ میں مناظرے کیا کرتے تھے۔ کہ انسان مجبور ہے یا مختار ہے۔ بالفاظ دیگر مسئلہ تقدیر کے بارہ میں اسی طرح مناظرے کیا کرتے تھے جیسا کہ صفاتِ الٰہیہ کے بارے میں کرتے تھے۔ نصاریٰ کے ذریعہ ہی سے —— فتح شام کے بعد —— یہ عقائد معتزلہ میں سرایت کرتے چلے گئے۔ اس اموی عصر میں جو لوگ مسلمانوں پر بہت زیادہ اثر انداز ہوئے وہ یحییٰ دمشقی، تھیودر ابو کارا (ABUCARA) وغیرہ عیسائی ہیں۔ یحییٰ نے اس مسئلہ میں بھی گفتگو کی ہے کہ بھلائی خدا سے اسی طرح صادر ہوتی ہے جیسے آفتاب سے اسکی روشنی صادر ہوتی ہے۔ چنانچہ معتزلہ کے ابتدائی عصر میں لوگوں نے تقدیر اور صفات الٰہیہ کے مسائل میں نصاریٰ سے سیکھ سیکھ کر گفتگوئیں شروع کیں۔

لیکن میری رائے یہ نہیں ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ تقدیر کا مسئلہ خود مسلمانوں ہی سے پیدا ہوا ہے . . . . . بظاہر یہ فکر ہر مذہب کے گرد پیدا ہوتا ہی ہے چنانچہ یہودیت، نصرانیت اور مجوسیت تمام ادیان میں یہ چیز موجود تھی۔ جب اسلام ظاہر ہوا تو اس میں اگر اس عقیدہ نے جگہ لیلی تو اسے نصرانی الاصل کیوں قرار دیا جائے؟ معتزلہ کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ لوگ نصاریٰ کے مقابلہ میں ان کے مناظرے فارس کے مجوسیوں کے ساتھ زیادہ تر ہوتے تھے اور ان کے مذہب کے اکثر اصول اہل فارس کے رد کیلئے وضع ہوئے ہیں نہ کہ نصاریٰ کے رد کیلئے۔ انھوں نے زیادہ تر

[1] فون کریمر۔

فرقہ جہمیہ کی تردید کی ہے جس کا بانی جہم بن صفوان خراسانی الاصل تھا۔ لہٰذا ہماری رائے یہ ہے کہ ابتداءً معتزلہ کی پیدائش خالص اسلامی ہے اگرچہ وہ دوسرے مذاہب سے بھی متاثر ضرور ہوئے ہیں۔ ایک تو اس بنا پر کہ ان ادیان والے زیادہ تر معتزلہ ہی کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بناتے تھے چنانچہ جب کوئی مجوسی اسلام میں تجسیم کا عقیدہ داخل کرتا تھا یا جبر کا عقیدہ پھیلاتا تھا تو اسکے مقابلہ پر معتزلہ ہی آتے تھے لیکن یہ لوگ اپنے دلائل میں زیادہ تر اسلام اور عقل پر مدار رکھتے تھے۔ لیکن معتزلہ کے پہلے عصر کے بعد عباسی عہد میں کیا ہوا یہ ایک دوسرا موضوع ہے جسے ہم معتزلہ پر کلام کرتے ہوئے بیان کرینگے۔

. . . .

یہ عجیب بات تھی کہ عیسائیوں کے گرجے دو متناقض چیزوں کا سرچشمہ تھے۔ ایک طرف زہد و ورع اور ترک دنیا کا سرچشمہ اور بعض مسلمان زاہدوں کی آماجگاہ تھے جو راہبوں کے اقوال ترکِ دنیا اور ترکِ لذت سے متعلق نقل کرتے تھے۔ لیکن دوسری طرف عاشق مزاج شعراء اور ادیبوں کی آماجگاہ بھی یہی گرجے تھے۔ یہ شعراء ان گرجاؤں کے لونڈوں اور ان کی ننوں سے تشبیبیں کرتے تھے اور ان کے متعلق آزاد اور حسین اشعار کہتے تھے یہ گرجے عموماً نہایت حسین جگہوں پر بنے ہوتے تھے جہاں کے مناظر اور ہوا پاکیزہ ہوتی تھی اور طرح طرح کے باغیچوں کے اندر یہ گرجے ہوا کرتے تھے۔ ان باغیچوں میں قسم قسم کے پھول پتے لگائے جاتے تھے۔ . . . . . شراب فروشوں نے ان کے گرداگرد شراب کی دکانیں کھول رکھی تھیں۔ ابن فضل اللہ عمری کا بیان ہے کہ "کنواریوں کے گرجا کے اردگرد شراب فروشوں کی دکانیں، باغات اور تفریحی مقامات ہوتے تھے"۔[1] بعض گرجاؤں کی سالانہ عیدیں اور جشن ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ خالدی نے دیرا لکلب کے متعلق بیان کیا ہے کہ "سال میں ایک مرتبہ اسکی عید ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں نصرانی مرد اور عورتیں گرجا میں آکر رہتے ہیں مسلمانوں کا انبوہ عظیم انھیں دیکھنے اور سیر و تفریح کرنے وہاں جاتا ہے۔ آزاد منش لوگ اور شعراء وہاں جمع ہو جاتے ہیں جہاں طرح طرح کے گانے اور ناچ وغیرہ ہوتے ہیں۔ قربانیاں ذبح ہوتی ہیں اور خوب شرابیں لنڈھائی جاتی ہیں"۔[2]

اس طرح مسلمانوں میں یہود و نصاریٰ کی بعض مذہبی عادتیں بھی سرایت کر گئیں چنانچہ بعض مسلمان بھی نصرانی عیدوں اور جشنوں کو منانے لگے تھے چنانچہ یوم السعانین (جو نصرانیوں کی ایک عید تھی) عباسی عصر میں بلکہ اسکے بعد تک مسلمانوں میں رائج رہا ہے جس کے بارہ میں شعراء نے کافی اشعار بھی کہے ہیں۔ . . . . ابن تیمیہ کی رائے ہے کہ مسلمانوں نے قبروں پر قبے اور مسجدیں بنانا یہود و نصاریٰ ہی سے سیکھا ہے۔ اس بارہ میں بہت سی حدیثیں بھی منقول ہیں مثلاً یہ کہ "تم سے پہلے لوگ قبروں پر مسجدیں بنایا کرتے تھے۔ یاد رکھو تم ہرگز قبروں پر مسجدیں نہ بنا لینا"۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں "میں اس امر کو ناپسند کرتا ہوں کہ کسی مخلوق کی تعظیم کی جائے حتیٰ کہ اسکی قبر کو مسجد بنا لیا جائے کیونکہ مجھے اس سے ایسا کرنے والوں اور بعد کی نسلوں کیلئے فتنہ کا اندیشہ ہے"۔[3] ابن تیمیہ نے وہ بہت سی بدعتیں گنائی ہیں جو زیارتِ قبور کے سلسلے میں کی گئی ہیں مثلاً ضریحیں بنانا، چراغ روشن کرنا، دعا کیلئے قبروں کی طرف متوجہ ہونا وغیرہ۔ اور آخر میں کہا ہے کہ "یہ تمام چیزیں وہ بدعتیں ہیں جو مسلمانوں نے دینِ نصاریٰ سے مستعار لی ہیں"۔[4]

مختصر یہ کہ ان تمام باتوں پر نظر کرنے سے یہ بات بآسانی معلوم ہو جاتی ہے کہ ـــــ عصر عباسی میں ـــــ مسلمانوں میں یہودیت اور نصرانیت سے تفسیر، حدیث، دینی طریقوں، عادات و رسوم وغیرہ میں کچھ کم چیزیں داخل نہیں ہوئیں۔ اور اس عصر کی عام ثقافت کے عناصر میں سے یہودیت اور نصرانیت دو اہم عنصر تھے۔

---

[1] مسالک الابصار ج ا صفحہ ۲۵۵ [2] ص ۲۵۴ [3] اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیہ صفحہ ۱۴۰ اور اس کے بعد۔ [4] ایضاً صفحہ ۱۷۵۔

مذہب اور سیاست

مسلم ممالک کا بحران

[لنڈن کے سب سے زیادہ مشہور اخبار "ٹائمز" نے اپنی یکم نومبر ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں "مسلم ممالک کے بحران" کے عنوان سے حسب ذیل مقالۂ افتتاحیہ شائع کیا ہے۔ ہم اس کا ترجمہ طلوع اسلام میں کیوں شائع کر رہے ہیں، اس کے متعلق اخیر میں ہمارا تبصرہ دیکھئے۔ طلوع اسلام]

مصر سے لیکر ایران، پاکستان اور انڈونیشیا تک تمام مسلم ممالک سے بحران اور گہری مشکلات کی خبریں برابر آ رہی ہیں۔ بعض ممالک کے واقعات کی نوعیت میں بڑی یکسانیت ہے۔ کہیں انتظامی دشواریاں اور دستوری مباحث ہیں۔ کہیں متشدد مذہبی گروہوں کے بڑھے ہوئے مطالبات ہیں۔ کہیں مضبوط فوجی قوت کی مدد سے نظم و نسق قائم کیا جاتا ہے۔ پوچھنے کا سوال یہ ہے کہ آیا کسی قوم کو مجتمع رکھنے کے لئے اسلام میں وہ قوت موجود ہے جس کا دعویٰ کیا جاتا ہے؟

اس عظیم الشان مذہب کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ دنیاوی معاملات میں اس نے ایسا ضابطۂ عمل دیا ہے جو دیگر مذاہب عالم کے مقابلہ میں زیادہ مستحکم ہے اور جس کی تعبیر میں لچک کی گنجائش کم ہے۔ لہٰذا اسلامی بنیادوں پر ایسی حکومت کی تعمیر کا کام جیسی حکومت کہ نئی اقوام چاہتی ہیں خاص مشکلات سامنے لے آتا ہے۔ ان تمام بڑے بڑے اسلامی ممالک میں غلبۂ مغرب کے خلاف قومی جدوجہد کو تقویت پہنچانے اور بالآخر آزادی حاصل کرنے میں مذہب کا حصہ نہایت اہم رہا ہے۔ لیکن حصول آزادی کے بعد مذہبی رہنماؤں کی سیاسی رہنماؤں سے اکثر ان بن رہی ہے جو اپنی نو یافتہ طاقت کو ایسی حکومت کے قیام کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں جو آجکل کے مغربی انداز کی "خوشحالی کی ریاست" کے مماثل ہو لیکن حکومت کے ذریعہ اسلام کی مخصوص سیاسی روایات کو اقتصادی اور تمدنی ترقی کی قومی امنگوں کے ساتھ منطبق کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس لئے یہ کوئی اتفاقی امر نہیں کہ جنگِ عظیم کے بعد جو نئی حکومتیں مصر، ایران، پاکستان اور انڈونیشیا میں برسر اقتدار آئیں انھیں ایسی مشکل اور گہری معاندانہ مذہبی تحریکات سے دوچار ہونا پڑا جو اس بات پر تلی ہوئی تھیں کہ حکومت کا تمام کاروبار بلا استثنا ان اسلامی خطوط پر ہونا چاہیئے جنھیں وہ اسلامی قرار دیں۔ ان تحریکات کے حامیوں نے عوام کی حمایت حاصل کرنے کیلئے اپنا طریق کار یہ رکھا کہ ہمیشہ ان قومی مطالبات کو اچھالیں جو ہنوز پورے نہ ہو سکے ہوں اور ایسی شکایات کو ہوا دیتے رہیں جن سے عوام زیادہ دلچسپی لیں۔ مصر کی اخوان المسلمین ایران اور پاکستان کے رجعت پسند ملا اور انڈونیشیا کی دارالاسلام پارٹی نے گذشتہ چند سالوں میں جو کچھ کیا ہے اس سے ان چاروں ملکوں کی مشکلات سمجھ میں آ سکتی ہیں۔

تنگ نظر، ضدی اور متشدد عناصر نے ان ملکوں کی سیاسی زندگی پر جو اس طرح یلغار کی تو اس نے بھیانک اثرات پیدا کر دیئے اور ان

بھیانک اثرات میں تباہ کن اضافہ نئی حکومتوں کی اس کوتاہی نے کیا جو عوام کی اشد اور اہم ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے میں ان سے ہوئی۔ ایران میں شاہ کے اعتدال پسند خیالات کو مفاد پرستیوں نے پس پشت ڈالا۔ مصر میں رشوت خور بادشاہ اور ضمیر فروش سیاسی رہنماؤں نے عوام کے مصائب کی طرف سے کان بند کر لئے۔ پاکستان میں دو عظیم الشان رہنماؤں کے ختم ہو جانے کے بعد جن کی آواز پر قوم لبیک کہنے کو آمادہ تھی ان کے جانشینوں نے بڑی کوشش کی کہ تقسیم کے بعد جو کچھ تنکے میسر آئے تھے انہی سے عمدہ نظام قائم کر لیں لیکن نسلی تقسیم صوبائی حسد اور ذاتی چشمک ان کے راستہ میں بری طرح حائل ہوئی۔ انڈونیشیا میں ابھی لوگ آزادی کے اولیں ثمرات سے متمتع نہ ہونے پائے تھے کہ تجربہ کار کارکنوں کے فقدان، سیاسی پارٹیوں کی کثرت اور دارالسلطنت میں سیاسی راہ نماؤں کی ہماہمی نے ملکر لوگوں کی آنکھوں سے غریب کے پردے اٹھا دیئے اور اس طرح انھوں نے بہت جلد حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیا۔ اس طرح ان چاروں اسلامی ملکوں میں جہاں ایک طرف سیاسی راہ نماؤں کی پہلی کھیپ جو وہاں جنگ کے بعد برسر اقتدار آئی، قوموں کی آرزوں کی واضح اور قطعی تشکیل میں عام طور پر ناکام رہی، وہاں دوسری طرف رجعت پسندانہ قوتوں نے مذہبی یا مذہب نما پیشوائیت کے نقاب میں اگر ان مملکتوں کے وجود کو خطرہ میں نہیں ڈال دیا تو کم از کم ان کے داخلی نظم و نسق کو اور امن و امان کو ضرور مخدوش کر دیا ہے لیکن (غنیمت ہے کہ قبل اس کے کہ حالات بالکل تباہ کن صورت اختیار کر لیتے ان کا علاج سوچ لیا گیا ہے راشی پولیٹیکل لیڈروں کو اقتدار سے محروم کر دیا گیا ہے اور ایسے رہنماؤں نے ان کی جگہ لے لی ہے جن کے دل عوام کی بہبود کیلئے بیتاب ہیں۔ فرقہ پرستی کو دبا دیا گیا اور اس کے حامیوں کا پول کھولا گیا ہے۔ اور نظم و نسق کو عمدہ اور منصفانہ بنانے کی حقیقی کوشش کی جا رہی ہے۔ ان چاروں ملکوں میں تباہی سے بچنے کیلئے جو طریق کار اختیار کیا جا رہا ہے اس کے خطوط عام طور پر یکساں ہیں۔ اس طریق کار کی جان تجربہ کار کارکن ہیں خواہ وہ فوجی ہوں یا سول ملازم۔ مملکت کی کشتی کو زیر آب چٹانوں کی ٹکر سے بچانے کیلئے یہ کارکن لنگر کا کام دے رہے ہیں۔ مصر اور ایران میں اصلی اقتدار فوج کے ہاتھ میں ہے۔ پاکستان میں بھی اقتدار ان تجربہ کار افسران کے ہاتھ میں ہے جو پرانی سول اور پراونشل ملازمتوں سے متعلق ہیں اور جن کی پشت پر فوج ہے۔ انڈونیشیا میں بھی ملازمین سرکار کی نئی پود ہی امیدوں کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

ایران میں جہاں مغربی قسم کے سیاسی ادارے عرصہ سے قائم ہیں اور لوگوں کے دل میں شاہ کا بڑا احترام ہے تشدد پسندوں اور تودہ باغیوں سے اقتدار چھین لیا گیا ہے۔ مصر میں پارلیمانی طرز حکومت میں رشوت اور پارٹی بازی کا بازار اس قدر گرم تھا کہ جب اس کی جگہ عمدہ فوجی اقتدار نے لے لی تو مفاد پرستوں کے سوا کسی کو ذرا سا بھی افسوس نہ ہوا۔ پاکستان میں اگرچہ دستوریہ کے ختم کئے جانے پر افسوس کرنے والے کم نہیں تاہم اقتدار ایسی وزارت کو سونپ دیا گیا ہے جس میں صرف قابلیت کو ترجیح دی گئی ہے اور جس کے سپرد یہ اہم فریضہ ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں اور ایک طرف لاہور اور پشاور اور دوسری طرف کراچی میں توازن قائم رکھے۔ ممکن ہے اور تبدیلیاں بھی زیر غور ہوں لیکن جو کچھ بھی ہوگا خیال ہے کہ وہ اس انداز کار سے بہرحال بہتر ہوگا جس میں خود ساختہ مفاد پرستوں کو سول سروس اور فوج کو اپنے لئے استعمال کرنے کا موقع حاصل تھا۔

آسانی سے نظر آ جاتا ہے کہ ان ممالک کی بیشتر مشکلات آداب جہانبانی میں ناتجربہ کاری کا نتیجہ ہیں۔ حصول آزادی کے فوراً بعد

ان ممالک کو نظم ونسق کا قیام اور صنعت کی ابتدا بے سروسامانی کے عالم میں کرنی پڑی۔ اسلئے ناکام تجربوں اور غلطیوں کا ہونا یقینی تھا لیکن ان مشکلات میں سب سے زیادہ اضافہ مذہب کے اجارہ داروں کی اس کوشش نے کیا کہ حکومت کی تشکیل ہم کریں گے۔ عام طور پر مذہب پرستوں کو عوام کا اعتماد حاصل نہیں۔ اور بیشتر ممالک میں قابل اور سمجھدار رہنما موجود ہیں لیکن مشکلات اور خطرات بھی موجود ہیں۔ اسلامی بنیادوں پر جدید طرز کی حکومت کے قیام کا مسئلہ کسی مسلم ملک میں بھی تاحال طے نہیں ہو سکا ہے۔

طلوعِ اسلام

لنڈن ٹائمز نے مسلم ممالک کے سیاسی حالات کا جو تجزیہ کیا ہے (بعض جزئیات کو چھوڑ کر، باقی حصہ سے) سنجیدہ اہلِ فکر کو اتفاق ہوگا۔ ان نوزائیدہ مملکتوں میں مذہبی جماعتوں نے جس قسم کا خلفشار پیدا کر رکھا ہے اس کے تباہ کن اثرات سے اور کوئی ناآشنا ہو تو ہو، قارئین طلوعِ اسلام تو ناواقف نہیں ہو سکتے، انھیں معلوم ہے کہ ہم کس طرح گذشتہ سات سال سے اس حقیقت کو برابر دہراتے چلے آئے ہیں کہ ان مذہبی جماعتوں نے امت کو نہ کبھی آرام سے بیٹھنے دیا ہے، نہ اب بیٹھنے دیں گی۔ قرنِ اول میں مذہبی پیشواؤں کا الگ کوئی وجود نہ تھا۔ اس کے بعد مسلمان بادشاہوں نے اپنے مفاد کی خاطر اس جنس کی تخلیق کی تاکہ یہ ان کے فیصلوں کو خدائی فیصلے قرار دیکر عوام سے منواتے رہیں اور مساجد کے ممبروں سے ان کے نام پر درود وسلام بھیجتے رہیں۔ ہندوستان میں انگریزوں نے مملکت کے نظم ونسق کو اپنے ہاتھ میں رکھا اور ان مذہبی پیشواؤں کے عمل دخل کو مسجدوں اور مکتبوں کی چار دیواری تک محدود کر دیا۔ اس سے ان کی سلطنت بڑے ٹھکانے سے چلی۔ تحریک آزادی کے دوران میں مولانا محمد علی مرحوم اپنے مخلص جذبات کے جوش میں انھیں حجروں اور مدرسوں سے کھینچ کر میدانِ سیاست میں لے آئے اور امت کیلئے پھر ایک مصیبت کھڑی ہوگئی۔ تحریکِ پاکستان میں قوم کی سعی وعمل کا اتنا حصہ انگریز اور ہندو کی مدافعت میں صرف نہیں ہوا ہوگا جتنا حصہ اس مخالفت کے فرو کرنے میں صرف ہوا جو "مقدسین" کے طائفہ کی طرف سے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے مطالبہ کے خلاف ہو رہی تھی۔ پاکستان بنا، تو یہ مخالف عنصر ہجوم کر کے یہاں چلا آیا اور یہاں بھی قوم کے لئے وہی صورت پیدا کر دی۔ چنانچہ قوم کی گاڑی کے پہیے ان کی قباؤں اور عباؤں میں اس بری طرح سے الجھ چکے ہیں کہ وہ ایک قدم آگے چلنے کے بھی قابل نہیں رہی۔

(۲) یہ تو محض ضمناً لکھا گیا ہے۔ ہم نے جس مقصد کے لئے لنڈن ٹائمز کے اس افتتاحیہ کو شائع کیا ہے وہ اب سامنے آتا ہے۔ اس نے دو اہم سوال اٹھائے ہیں۔

(۱) کیا اسلام میں وہ قوت موجود ہے جو کسی قوم کے لئے وجہِ جامعیت بن سکے؟

(۲) کیا کوئی ایسا نظام بنایا جا سکتا ہے جو اسلام کی بنیادوں پر بھی قائم ہو اور دورِ حاضرہ کے تقاضوں کو بھی پورا کر دیتا ہو؟

ان دونوں سوالوں کا جواب نفی میں بھی ہے اور اثبات میں بھی۔ مثلاً پہلے سوال کو لیجئے ——— یہ واقعہ ہے کہ قرنِ اول میں اسلام ہی وہ قوت تھی جس نے مختلف اقوام، مختلف ممالک، مختلف معاشروں، مختلف مذاہب کے افراد کو اس طرح ملت واحدہ

بنا دیا تھا کہ وہ قرآن کے الفاظ میں ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح قائم تھی۔ قرآن نے انہی کو رُحماءُ بینھم کا سرٹیفکیٹ دیا تھا اور دنیا بھر کے مورخین ان کی مودت و یگانگت کی شہادت دیتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی واقعہ ہے کہ آج اسی اسلام کے نام لیوا اور اسی امت کے اخلاف دنیا کے مختلف حصوں میں بستے ہیں لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ ہر ملک کے مسلمان اپنے آپ کو الگ قوم سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک ہی ملک میں بسنے والے مسلمان جو مختلف صوبوں میں رہتے ہیں اپنے آپ کو الگ الگ قوم سمجھتے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے اس کی وجہ وہی ہے جسے محترم پرویز صاحب نے اپنی گراں مایہ تصنیف "اسباب زوال امت" میں بیان کیا ہے انھوں نے اس میں بتایا ہے کہ قرنِ اول میں اسلام ایک دین کی حیثیت لئے ہوئے تھا لیکن بعد میں وہ صرف ایک مذہب بن کر رہ گیا۔

دین ـــــ مختلف افراد میں بنیادی یگانگت کا ذریعہ بنتا ہے لیکن مذہب ایک انفرادی چیز ہوتی ہے جو مختلف افراد میں وجہ جامعیت نہیں بنتی ـــ دین ـــــ نظامِ زندگی یا دورِ حاضر کی اصطلاح میں نظامِ مملکت (سسٹم آف اسٹیٹ یا سوشل آرڈر) کو کہتے ہیں۔ اور مذہب ـــــ چند ذاتی عقائد اور پرستش کی رسومات کو ـــــ اگر آپ یہ سمجھنا چاہیں کہ نظامِ مملکت کی وحدت کس طرح باہمی یگانگت کا موجب بنتی ہے اور مذہب میں کس طرح تفریق پیدا ہوتی ہے تو آپ یورپ کی مثال کو سامنے رکھئے ـــــ روس ـــــ ایک خاص نظام کا حامل ہے (ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں کہ وہ نظام غلط ہے یا صحیح) دنیا کے جس جس حصہ میں وہی معاشی نظام قائم ہے ان کی باہمد گر اور سب کی روس کے ساتھ یگانگت ہے۔ جنوبی امریکہ کے کمیونسٹ اور شمالی روس کے کمیونسٹ میں ایک گہری وجہ جامعیت موجود ہے اس کے برخلاف جرمنی اور فرانس کو لیجئے۔ دونوں کا مذہب عیسائیت ہے لیکن دونوں ایک دوسرے کی جان کے لاگو رہتے ہیں۔ انگلستان اور اٹلی والوں کا مذہب بھی عیسائیت ہے۔ اسی طرح امریکہ اور جرمنی کا بھی۔ لیکن ان میں مذہب کبھی وجہ جامعیت نہیں بن سکا۔ اس کیلئے انھیں سیاسی مفاد کے اشتراک کو ڈھونڈھنا پڑتا ہے۔ یہ ہے فرق ـــ دین اور مذہب میں۔ اسلام مذہب نہیں ـــــ دین ہے۔ جب تک یہ دین رہا یہ متضاد عناصر میں بڑی گہری یگانگت اور شدید جامعیت کا موجب بنا رہا۔ جب یہ مذہب کی سطح پر آگیا تو مسلمانوں کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا جو عیسائیوں کے ہاں ہو رہا ہے۔ اب مختلف اسلامی ممالک کو باہمی اتحاد کیلئے سیاسی اور تجارتی معاہدے کرنے پڑتے ہیں۔ اگر ان ممالک کا نظامِ مملکت ایک ہوتا (یعنی ان کے ہاں اسلام ایک دین کی حیثیت سے قائم ہوتا) تو انھیں الگ معاہدوں کی ضرورت ہی نہ تھی۔ دنیا میں نظامِ معاشرت کی وحدت سے بڑھ کر کوئی اور وجہ جامعیت نہیں ہوا کرتی۔ (وہ نظامِ معاشرت جس کی بنیاد عالمگیر، غیر متبدل اور مستقل اقدار پر ہو)۔ لہٰذا لنڈن ٹائمز کے پہلے سوال کا جواب نفی میں اسلئے ہے کہ جب تک اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے رہیگا، یہ مختلف قوموں کے درمیان وجہ جامعیت نہیں بن سکے گا۔ اور اس کا جواب اثبات میں اس طرح ہے کہ اگر اسلام نے پھر اپنی اصلی پوزیشن حاصل کر لی یعنی اسے بطور دین اختیار کیا گیا تو پھر اس سے بڑھ کر اور کوئی محکم وجہ جامعیت نہیں ہو سکتی۔

اب لیجئے لنڈن ٹائمز کا دوسرا سوال۔ اس کا جواب نفی میں اس طرح ہے کہ مذہب کا جو تصور ملا کے ذہن میں ہے اس کی رو سے کسی اسلامی مملکت کا نظام ایسا نہیں بنایا جا سکتا جو مذہبی تقاضوں کو بھی پورا کرے اور اس کے ساتھ ہی دورِ حاضر کی ضروریات کو بھی پورا کر سکے۔ ملا کے نزدیک مذہب کا تصور یہ ہے کہ ہم سے پہلے جن امور کے فیصلے مسلمانوں کے مختلف زمانوں میں ہو چکے ہیں، وہ غیر متبدل ہیں۔ ان میں

نہ کسی قسم کا ردوبدل کیا جا سکتا ہے نہ نسخ و اضافہ۔ ان امور کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ کوئی سوال ایسا باقی نہیں رہا جس کے متعلق پہلے سے فیصلہ موجود نہ ہو (دیکھئے مولانا ابوالحسنات صاحب کا بیان جو انھوں نے پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے دیا) جو ان میں سے ذرا زیادہ ماڈرن بننے کی کوشش کرتے ہیں وہ بھی اس حد تک جاتے ہیں کہ

جزئیات کے متعلق صریح شرعی احکام ہم کو صرف انہی حوادث اور انہی امور کے متعلق معلوم ہو سکتے ہیں جو رسول اللہؐ کے عہد میں پیش آئے تھے۔ باقی رہے وہ حوادث جو حضورؐ کے بعد پیش آئے تو ان کے متعلق شرع میں کوئی صریح حکم نہیں مل سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب اگر کوئی ایسا حادثہ پیش آتا ہے جو صحابہ یا ائمہ کے دور میں پیش نہیں آیا یا کوئی ایسی چیز ایجاد ہوتی ہے جو اس دور میں موجود ہی نہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ تو ایسے حادثہ اور ایسی چیز کیلئے ہمیں اصول و کلیات کی طرف رجوع کرنا پڑیگا (ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔ تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۳)

بہرحال صورت یہ ہو یا وہ۔ مذہب پرستوں کا دعویٰ یہ ہے کہ جن امور کے متعلق اس سے پہلے فیصلے ہو چکے ہیں ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کیا جا سکتا۔ (واضح رہے کہ مودودی صاحب کی تحریروں میں اسقدر تضاد ہوتا ہے یا تضاد رکھا جاتا ہے کہ کوئی شخص یہ کہہ ہی نہیں سکتا کہ ان کا حتمی اور یقینی مسلک کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ مملکت کے قانون کی تعبیر فقہ حنفی کے مطابق ہونی چاہئے اور یہ ظاہر ہے کہ فقہ حنفی کی رو سے زندگی کے تمام معاملات کے متعلق پہلے سے فیصلے موجود ہیں اور مزید اجتہاد کا دروازہ مدت ہوئی بند ہو چکا ہے)۔ اس عقیدہ یا مسلک کی رو سے کوئی اسلامی مملکت مذہب کو اپنے دستور اور قانون کی بنیاد قرار دیکر ایک دن کیلئے بھی آگے نہیں چل سکتی۔

اور اس سوال کا جواب اثبات میں اس طرح ہے کہ قرآن، نظامِ زندگی کے بنیادی اصول عطا کرتا ہے اور ہر دور کے مسلمانوں کو اس کا اختیار دیتا ہے کہ وہ ان اصولوں کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق اپنے لئے قوانین خود وضع کریں۔ یہ اصول تو غیر متبدل رہیں گے لیکن ان اصولوں کی روشنی میں وضع کردہ جزئیات عند الضرورت بدلتی رہیں گی۔ دین کے اس تصور کی رو سے کسی مملکت کیلئے یہ مشکل نہیں کہ وہ اسلام کو اپنے دستور کی بنیاد قرار دے اور پھر زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے ساتھ بھی چلتی جائے۔

پاکستان کی مجلس آئین ساز نے یہی حماقت کی کہ انھوں نے ملا کے پیش کردہ مذہب کو آئین کی بنیاد قرار دیا اور اس کے بعد اسے دورِ حاضرہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ جوڑنا چاہا۔ اس کا جو کچھ نتیجہ نکلا وہ ظاہر ہے۔ یہ تو غنیمت ہوا کہ وہ آئین کہیں نافذ نہیں کر دیا گیا، ورنہ آپ دیکھتے کہ یہاں قدم قدم پر کسقدر مشکلات پیش آتیں۔ یہ جو ہمارے اربابِ حل و عقد میں سے بعض پکار اٹھتے ہیں کہ ہم مذہب میں سیاست کو دخل انداز نہیں ہونے دیں گے، تو یہ درحقیقت اسی سانپ کے ڈسے ہوئے ہیں۔ اسی زہر کا اثر تھا کہ مصطفےٰ کمال نے عملاً ایک ایسی ریاست قائم کر دی جس میں مذہب کو امورِ مملکت سے الگ کر دیا گیا۔ ہمارا خیال ہی نہیں، یقین ہے کہ اگر ہمارے اربابِ بست و کشاد کے سامنے دین کا وہ تصور ہو جسے قرآن نے پیش کیا ہے تو ان کا خیال بھی اسطرف نہ جائے کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہئے۔ لنڈن ٹائمز کے سامنے جو دشواری ہے وہ بھی یہی ہے کہ ان کے ہاں بھی پادریوں کا پیدا کردہ مذہب ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دیا ہوا دین نہیں ہے۔ اے کاش ہمارے اربابِ اقتدار کے سامنے مذہب اور دین کا یہ فرق ہوتا۔ اسوقت آپ دیکھیے کہ نہ صرف یہ کہ خود بھی نہ کہتے کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہئے بلکہ یہ لنڈن ٹائمز کے اس اعتراض کا بھی جواب دے سکتے، جسے اس نے تمام دنیائے اسلام کے سامنے اس طرح پیش کیا ہے۔

باب المراسلات

۱۔ غلط معاشرہ میں اصول پرستی لاہور سے ایک صاحب نے اپنے خط میں ایک اہم سوال اٹھایا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ آجکل ہمارے معاشرہ کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ اس میں سچ بولنا اور دیانت داری سے کام کرنا عام طور نقصان کا موجب ہوتا ہے۔ اور جھوٹ اور بددیانتی سے بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ کیا ایسی حالت میں یہی بہتر نہیں کہ انسان وہی کچھ کرے جو باقی دنیا کر رہی ہے اور اس طرح ناکامیوں سے پیچھا چھڑا لے۔

طلوع اسلام: یہ وہ سوال ہے جو آجکل قریب قریب ہر ایک دماغ کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ بعض جرأت کر کے اسے زبان تک لے آتے ہیں۔ باقی اسے اپنے دل میں دہراتے رہتے ہیں۔

قرآن یہ بتاتا ہے کہ کچھ مستقل اقدار ہیں جن میں کسی زمانہ اور کسی حالت میں بھی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور انسان کیلئے ضروری ہے کہ کسی صورت میں بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑے۔ مثلاً معاملات میں دیانتداری۔ اگر ہم دیانت داری کو اسی حد تک اپنے ساتھ رکھیں جس حد تک اس کے ساتھ رکھنے سے فائدہ ہو اور جب ایسا کرنے سے نقصان ہونے لگے چھوڑ دیا جائے تو کھلے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسے مستقل قدر نہیں سمجھتے۔ لہٰذا پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ ہم ان چیزوں کو مستقل اقدار مانتے ہیں یا نہیں۔ اگر ہم ایسا مانتے ہیں (اور اسی کو ایمان کہتے ہیں) تو پھر یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ انھیں کس وقت ساتھ رکھا جائے اور کس وقت چھوڑ دیا جائے۔ انھیں بہرحال ساتھ رکھنا ہوگا۔ اور اگر ہم انھیں مستقل اقدار سمجھتے ہی نہیں تو پھر یہ پوچھنا اور سوچنا ہی بیکار ہے کہ نقصان کی صورت میں ہم کیا کریں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ تمہارا فریضہ اتنا ہی نہیں کہ تم نامساعد حالات میں اپنے اپنے طور پر ان اقدار سے متمسک رہتے ہوئے نقصان اٹھاتے چلے جاؤ۔ ان حالات کے خلاف اعلان جنگ کر کے ان کی جگہ مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ کا قیام بجائے خویش ایک مستقل قدر ہے جسے کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہئے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ ان افراد کی رفاقت تلاش کی جائے جو مستقل اقدار پر اپنا ایمان رکھتے ہوں۔ ان رفقاء کی ہم مرکزی سے ان کی قوت بہت بڑھ جائیگی اور اس سے صحیح معاشرہ کے قیام میں ان کا قدم آگے بڑھتا جائے گا۔ یاد رکھئے کہ قرآن کی رو سے ایک فرد کا اپنا ذاتی اطمینان جنتی زندگی نہیں کہلاتا۔ جنتی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسی قسم کے افراد کے زمرہ میں داخل ہو جائے۔ قرآن نے نفسِ مطمئنہ کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی (۸۹-۲۹) کہ تو خدا کے بندوں کی جماعت میں شامل ہو اور اس طرح سے جنت میں داخل ہو۔ لہٰذا جو شخص غلط معاشرہ میں مستقل اقدار کا ساتھ نہیں چھوڑتا وہ بڑی ہمت کا ثبوت

دیتا ہے لیکن جو اتنے ہی پر مطمئن ہو جاتا ہے وہ اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کوتاہی کرتا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے جیسے افراد کے ساتھ مل کر غیر خداوندی معاشرہ کی جگہ خداوندی معاشرہ کے قیام کی کوشش کرے۔

۲۔ جمعہ کی چھٹی

کراچی سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ حکومت پاکستان کے دفاتر میں جمعہ کے روز ساڑھے بارہ بجے کے بعد باقی دن کی چھٹی ہو جاتی ہے اور اس طرح دفاتری کاروبار معطل ہو جاتا ہے۔ قرآن کی رو سے یہ فیصلہ کیسا ہے۔

طلوع اسلام: یہ فیصلہ قرآن کے منشاء کے مطابق نہیں۔ سورہ جمعہ سے ظاہر ہے کہ جمعہ کے دن حسب معمول کاروبار ہوگا۔ اس کاروبار کو چھوڑ کر لوگ اس اجتماع میں شرکت کے لئے آئیں گے اور اس سے فارغ ہو کر پھر کاروبار میں مصروف ہو جائیں گے فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ (۶۲/۱۰) اس پر شاہد ہے۔ قرآن کا یہ منشا نہیں ہے کہ جمعہ کے باقی دن میں کاروبار معطل کر دیا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنے مصالح کے پیش نظر جمعہ کا پورا دن چھٹی کر دیں لیکن موجودہ طریق جس میں جمعہ کے دن کی آدھی چھٹی، پھر ہفتہ کے دن کی آدھی چھٹی اور پھر اتوار کی ساری چھٹی دیدی جاتی ہے یہ بلاوجہ تضیع اوقات ہے تجربہ نے بتایا ہے کہ اتوار تو بند ہوتا ہی ہے، جمعہ اور ہفتہ کو بھی لوگ کچھ کام کر کے نہیں دیتے۔ کام کاج کے لحاظ سے حکومت کے دفاتر میں جو ابتری پھیلی ہوئی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس پر ہفتہ میں تین دن اس طرح ضائع کر دینا کہاں کی دانشمندی ہے۔

قرآن کے منشاء کے مطابق جمعہ کے دن تمام عمال حکومت اور عوام کو ایک مقام پر جمع ہونا چاہئے اور صدر مملکت یا عمال حکومت میں سے اس کے کسی نمائندہ کو چاہئے کہ وہ اس اجتماع سے خطاب کرے اور مملکت کے ضروری امور کی طرف ان کی توجہ منعطف کرائے۔ خطبہ جمعہ سے یہی مقصود تھا۔

۳۔ وفات مسیح

پشاور سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ مرزائی حضرات یہ کہتے ہیں کہ کیا مرزا صاحب کی نبوت کی یہ دلیل نہیں کہ انھوں نے وفاتِ مسیح جیسے اہم مسئلہ کو اس طرح وا شگاف کیا جس میں مسلمان اتنی بڑی غلط فہمی میں مبتلا تھے۔

طلوع اسلام: طلوعِ اسلام کبھی اس قسم کی بیکار بحثوں میں نہیں الجھتا۔ لیکن اس سوال میں ایک ایسی اصولی بات آگئی ہے جس کا سامنے لانا ضروری سمجھا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وفاتِ مسیح کے متعلق جو کچھ مرزا صاحب نے بتایا ہے وہ قرآن میں تھا یا نہیں؟ اگر وہ قرآن میں نہیں تھا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ قرآن ناقص تھا اور مرزا صاحب کی نبوت نے اس نقص کو پورا کیا ہے۔ اس کے بعد ان سے پوچھئے کہ وہ قرآن کو کس طرح مکمل مانتے ہیں۔ اور اگر انھوں نے یہ کچھ قرآن ہی سے ثابت کیا ہے تو پھر اس میں نبوت کا سوال کہاں سے پیدا ہو گیا۔ کہا جائیگا کہ قرآن میں تو یہ کچھ تھا لیکن وہ عام آدمیوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ اس کے لئے ایک نبی کی ضرورت تھی۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے بھیجا لیکن اس میں جو کچھ لکھا ہے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے پھر ایک نبی بھیجنا پڑا۔ غور کیجئے کہ اس کتاب کے متعلق کیا کہا جائے گا جس کے متعلق یہ عقیدہ رکھا جائے

کہ اس کا صحیح مطلب ایک نبی کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ اور کوئی اسے سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ اتنے سو سال تک مسلمانوں نے اسے سمجھ کیوں نہ لیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح مرزا صاحب روایتوں کے چکر میں الجھ کر اتنی سی بات نہ سمجھ سکے کہ مجدد، مہدی اور مسیح کے عقائد عجمیوں کی سازش کا نتیجہ ہیں۔ اسی طرح قرآن کو روایات کے تابع رکھنے سے یہ مسئلہ سمجھ میں نہ آسکا۔ مرزا صاحب کی "نبوت" نے انھیں یہ تو بتا دیا کہ حضرت مسیحؑ وفات پا چکے ہیں لیکن ان کی "نبوت" انھیں یہ نہ بتا سکی کہ مسیحؑ کی آمد کا عقیدہ (خواہ وہ کسی شکل میں ہو) عیسائیوں کی طرف سے آیا ہے، قرآن سے نہیں۔

پھر یہ بھی کون کہتا ہے کہ تمام امت میں سب سے پہلے مرزا صاحب نے وفاتِ مسیحؑ کی حقیقت کو بے نقاب کیا۔ ایسے لوگ پہلے ہو گذرے ہیں جو وفاتِ مسیحؑ کے قائل تھے۔ ان میں امام مالکؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۴۔ چودھری محمد ظفر اللہ خانصاحب کا جواب

دو ایک خطوط ایسے موصول ہوئے ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ احمدیوں کے رسالہ "الفرقان" نے کہا ہے کہ طلوع اسلام نے جن سوالات کا جواب چودھری محمد ظفر اللہ خان سے مانگا تھا، ان کا جواب ہم نے دیا ہے اور اس کے بعد طلوع اسلام خاموش ہے۔

طلوع اسلام: الفرقان سے کوئی پوچھے کہ انھیں مخاطب کس نے کیا تھا جو وہ جواب دینے کے لئے آگے بڑھ آئے۔ بات یوں چلی تھی کہ طلوع اسلام نے لکھا تھا کہ عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ اگر مرزائیت ایسا ہی پوچ مذہب ہے تو چودھری محمد ظفر اللہ خانصاحب جیسا قابل آدمی اس کا متبع کیوں ہے۔ اس کے جواب میں ہم نے لکھا تھا کہ چودھری صاحب کی عام قابلیت جو ہو سو ہو۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے ان کا علم ایسا ہی ہے جیسا خود مرزا صاحب کا تھا۔ اس کے بعد ہم نے لکھا تھا کہ چودھری صاحب نے اپنی کتاب میں اپنے جو عقائد گنائے ہیں وہ ان کی تائید میں قرآنی دلائل پیش کریں۔ چودھری صاحب نے آج تک ایسا نہیں کیا نہ ہی انھوں نے یہ کہا کہ فلاں صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اسے میری طرف سے سمجھا جائے۔ لہٰذا طلوع اسلام کے لئے اس باب میں مزید کچھ لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مرزائیوں کے ساتھ بیکار مباحث میں وہی الجھ سکتا ہے جس کے پاس بیکار وقت اور (اکبر کے الفاظ میں) فالتو عقل ہو۔ جن کے ہاں نہ قرآن ہو نہ علم، ان سے بات کیا کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی قوم علمی سطح میں اس شخص سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتی جسے وہ اپنا امام اور جس کے علم کو وہ خدائی علم مانتی ہو۔ لہٰذا کوئی مرزائی (خواہ وہ قادیانی ہو یا لاہوری) علم و عقل میں مرزا صاحب سے آگے بڑھنے کا تصور تک بھی نہیں کر سکتا۔ اور مرزا صاحب کی جسقدر علمی قابلیت تھی اس کا اندازہ ان کی کتابوں سے لگ سکتا ہے۔ جو ہر جگہ ملتی ہیں۔ ہم اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہتے ہیں کہ اگر کسی صاحب ذوقِ سلیم کو سخت ترین سزا دینی ہو تو اس سے کہئے کہ اسے مرزا صاحب کی کتابیں پڑھنی ہوں گی۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ ہفتہ بھر کے بعد چلا اٹھے گا کہ مجھے قید ہونا منظور ہے لیکن یہ ذہنی عذاب نہیں برداشت کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزائیت قبول ہی وہی کر سکتا ہے جس کے پاس نہ علم ہو نہ ذوقِ سلیم۔ مرزا صاحب کا زمانہ تو پھر بھی چالیس پچاس برس پہلے کا تھا۔ جن مرزائی حضرات نے ان کے بعد کتابیں لکھی ہیں یا آجکل لکھ رہے ہیں

انھیں اٹھا کر دیکھئے۔ ان کے علم اور ذوق کا اندازہ ہو جائے گا۔ لاہوری احمدیوں کو مقابلتہً زیادہ سمجھدار اور تجدد پسند کہا جاتا ہے اور ان میں ان کے مرحوم امیر محمد علی صاحب کو سب سے بلند پایہ مصنف قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی تفسیر القرآن اٹھا کر دیکھئے، کیا بلحاظ معنی اور کیا باعتبار اندازِ بیان ایسی پھسپھسی کتاب شاید ہی کہیں ملے۔ یہی حال ان کی اور تصنیفات کا ہے۔ ان میں جو ذرا بھی صاحب ذوق سلیم نکلے وہ مرزائی رہتا نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی اس کی یہ بغاوت سینہ کے اندر رہے اور کبھی بھڑک کر زبان تک بھی آ جائے۔

بہر حال ہم نے اپنے مستفسرین کے استفسار کا جواب ضروری سمجھا اور اتنا لکھ دیا ورنہ ہمارا جی نہیں چاہتا تھا کہ طلوعِ اسلام کے قیمتی صفحات ایسی بے کار باتوں کی نذر ہو جائیں۔ جن کے سامنے قرآن ہو وہ ان لغویات میں الجھنا کیا پسند کرتے ہیں اس لئے اس موضوع پر اس کے بعد کچھ نہیں لکھا جائے گا۔

پاکستان میں نظامِ شریعت رائج ہونا چاہیئے

لیکن یہ نظامِ شریعت ہوگا کیا؟

(۱) اقتدارِ اعلیٰ خدا کا۔ اطاعت صرف اس کی — (۲) خدا کی اطاعت کے معنی ہیں اس کی وحی کی اطاعت — (۳) ایک وحی قرآن میں ہے۔ لیکن وہ مجمل ہے — (۴) اس اجمال کی تفصیل دوسری وحی میں ہے جس کا نام احادیث ہے — (۵) لہٰذا خدا کی اطاعت سے مراد احادیث کا اتباع ہے۔

لیکن . . . احادیث غلط بھی ہیں اور صحیح بھی — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ — یہ صرف . . . مزاج شناسِ رسول بتا سکتا ہے؟ — یہ مزاج شناس کون ہیں؟ — اس کی تفصیل ادارۂ طلوعِ اسلام کی تازہ ترین پیشکش

مزاج شناسِ رسول

میں دیکھئے۔ ضخامت ۴۴۸ صفحات۔ مجلد معہ گرد پوش۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۔ کراچی

نقد و نظر

بینات باسرات طلوع اسلام کی اکتوبر ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں ڈاکٹر زاہد علی صاحب، وائس پرنسپل نظام کالج حیدرآباد دکن کی کتاب "تاریخ فاطمیین مصر" پر تبصرہ شائع ہوا تھا۔ اب ہمارے پاس بعض اسماعیلی حضرات کی وساطت سے زیر نظر کتاب پہنچی ہے جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی کتاب میں بہت سی غلطیاں ہیں۔ کتاب کے مؤلف شیخ عبدالقیوم ابن ملا حبیب اللہ ایڈووکیٹ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب بہت پہلے کی شائع شدہ ہے۔ کتاب میں پہلے تو یہ بتایا گیا ہے کہ ڈاکٹر زاہد علی صاحب اسماعیلی نہیں ہیں بلکہ مذہب اسمٰعیلی کے دشمن ہیں اور انھیں عقائد اسماعیلیہ سے بغضِ للّٰہی ہے اور انھوں نے یہ کتاب اپنے بخارات کے اظہار کے لئے لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی کتاب کے قارئین کو اس سے بہت کم دلچسپی ہو گی کہ ان کے ذاتی عقائد کیا ہیں۔ ہم نے جب ان کی دوسری کتاب "ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام" دیکھا ہے (جس پر اگست ۱۹۵۴ء کے طلوع اسلام میں تبصرہ ہو چکا ہے) تو ہمیں اس پر فی الواقع تعجب ہوا تھا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف ایک طرف اسماعیلی مذہب کے یہ عقائد بیان کر رہے ہیں جو اسلام کے یکسر خلاف ہیں اور اس کے باوجود اپنے آپ کو اسماعیلی بھی کہتے ہیں۔ لیکن جب ایک شخص اپنے آپ کو ایک مذہب کا پیرو کہتا ہے تو ہمیں اس کی بات ماننی ہی پڑے گی۔ زیر نظر کتاب میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ جو شخص امام اسماعیل کی امامت اور عصمت کا بھی قائل نہیں وہ اسماعیلی کس طرح ہو سکتا ہے۔ بہرحال اس کا جواب تو ڈاکٹر صاحب ہی کے ذمہ ہے کہ وہ ان چیزوں کے باوجود اسماعیلی کس طرح ہیں۔ باقی رہیں ان کی غلطیاں تو ان کا اندازہ اس سے لگ سکے گا کہ اس میں لکھا ہے:

> ڈاکٹر صاحب نے صفحہ ۵۴۸ کے فٹ نوٹ نمبر ۲ میں زہر المعانی سے ایک اقتباس پیش کیا ہے اور جو معنی سیدنا ادریس نے بیان فرمائے ہیں اس سے مستشرق ایوانو کا حوالہ دیکر اختلاف ظاہر کیا ہے۔ یہ حرم دعوت کے نواہائے راز ہیں۔ ان کا سمجھنا ڈاکٹر صاحب یا ایوانو کے بس کی بات نہیں۔

ظاہر ہے کہ جو امور "نواہائے راز" ہوں، انھیں ہمارے جیسا عامی بھی کیا سمجھ سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسماعیلی مذہب کی بنیاد ہی رموز و بواطن پر ہے جسے یہ حضرات خود ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس باب میں ان حضرات سے ہماری جو گذارش ہے وہ اگلی کتاب پر تبصرہ کے آخر میں ظاہر کی جائے گی۔

۲۔ عہدِ فاطمی میں علم وادب

مولفہ عاشق حسین صاحب پروفیسر جامعہ سیفیہ سورت۔ و محمد شاکر صاحب فارغ التحصیل جامعہ سیفیہ سورت۔ ناشر ڈی۔ بی بکڈپو ۴۶ مسجد بندر روڈ بمبئی۔

کتاب کے شروع میں لکھا ہے کہ "فاطمی ائمہ کرام علیہم السلام نے دنیائے علم وادب میں جو لازوال نقوش چھوڑے ہیں یہ کتاب ان کے تذکرہ کا ایک ادنیٰ ورق ہے"۔ کتاب اچھے کاغذ پر چھپی ہے۔ کتاب کے شروع میں قریب بیس صفحات میں فاطمی عقائد کو مختصر الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور یہی وہ حصہ ہے جس سے غیر اسماعیلی حضرات کو زیادہ دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ "فاطمیوں نے اپنے اماموں کو بشری جلد اور مانا ہے اور کبھی بھی ان کو الوہیت کے رنگ میں دیکھنے کا خیال تک نہیں کیا"۔ لیکن اسی پیراگراف کے آخر میں لکھا ہے کہ "زمین کبھی ظاہر امام یا امام مستور کی ہستی سے بے نیاز نہیں رہ سکتی ورنہ عالم کا ثبات نہ رہے اور وجودِ ہستی باطل ہو جائے"۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کائنات میں جس شخص کی پوزیشن یہ ہو کہ اس کے بغیر عالم کا ثبات نہ رہے اور وجودِ ہستی باطل ہو جائے اسے اگر الوہیاتی رنگ حاصل نہیں تو اس رنگ کا نام اور کیا رکھا جائے گا۔ پھر لکھا ہے کہ "ہر مومن پر امام کی معرفت لازمی ہے۔ اگر وہ دنیا سے بغیر معرفتِ امام کے چل بسا تو گویا وہ جاہلیت کی موت مرا۔ امام کی معرفت کے بغیر مومن کی نجات ناممکن ہے"۔ اللہ تعالیٰ نے نہ مومن ہونے کے لئے یہ شرط عائد کی ہے اور نہ کسی کی نجات کے لئے۔ اس سے آگے ہے "ہر امام زمان ولی امر ہوتے ہیں۔ ان کے حکم کی تعمیل ہر ایک پر فرض ہے۔ وہ معصوم ہوتے ہیں۔ ان سے کسی گناہ کا سرزد ہونا ممکن نہیں"۔ اس کے باوجود یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ فاطمی اپنے اماموں کو بشری جانتے اور مانتے ہیں۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ "انبیاء و مرسلین میں سات نطقا ہیں اور ہر نبی ناطق کے ایک قائم مقام ہوتے ہیں جو "وصی" کہلاتے ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰؑ کے وصی حضرت ہارونؑ تھے۔ اسی طرح رسول اللہ صلعم کے وصی حضرت علیؓ ہیں"۔ قرآن میں ناطق اور وصی کا کوئی ذکر نہیں۔ اور اگر حضرت علیؓ کی پوزیشن وہی ہے جو حضرت ہارونؑ کی تھی تو اس عقیدہ کے مطابق حضرت علیؓ کو نبی ماننا چاہیئے کیونکہ حضرت ہارونؑ کی نبوت پر خود قرآن شاہد ہے۔

اسماعیلی مذہب کی بنیاد اس دعوے پر ہے کہ علم کے دو پہلو ہوتے ہیں جلی اور خفی۔ ظاہر اور باطن۔ چنانچہ ان کا عقیدہ ہے کہ "قرآنی تعلیم میں ایک راز کا پہلو بھی ہے"۔ یہ راز نبی کے بعد وصی کو معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے "نبی صاحبِ تنزیل ہوتے ہیں اور وصی صاحب تاویل"۔ یعنی نبی پر تو قرآن اتر جاتا ہے لیکن اس کے معنی صرف ائمہ بتا سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ معانی قرآن کے الفاظ سے حاصل نہیں ہو سکتے بلکہ باطنی ذریعہ سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ عقیدہ قرآن کو عملاً منسوخ کر دیتا ہے اور وضع ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ مسلمان کی زندگی سے قرآن عملاً منسوخ ہو جائے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو تصوف کے نقاب میں مسلمانوں میں اس وقت تک چلا آتا ہے یعنی تصوف اسماعیلی عقائد ہی کی ایک نقاب پوش صورت ہے۔

لہ حسن اتفاق سے اس پرچہ میں محترم پرویز صاحب کا سلیم کے نام ایک خط شائع ہو رہا ہے جس میں انھوں نے تصوف کی اس بنیاد کو نمایاں کیا ہے۔ (طلوع اسلام)

خدا کے متعلق لکھا ہے کہ "اسماعیلی خدا کی ذات پر لفظ واحد کا اطلاق بھی خدا کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا کو کسی صفت سے موصوف کرنا اس کی ذات میں کثرت ثابت کرنا ہے جو شرک کا مترادف ہے۔" یہ عقیدہ ہندوؤں کے قدیم فلسفہ کا چربہ ہے جس میں وہ صفات کے اثبات سے خدا کا اقرار نہیں کرتے بلکہ صفات کی نفی سے اس کے متعلق گفتگو کرتے ہیں۔ اس کے برعکس قرآن ہے کہ وہ خدا کو اس کی صفات ہی سے متعارف کراتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی ذات انسان کے تصور میں نہیں آسکتی۔

ڈاکٹر زاہد علی صاحب نے اپنی کتاب "ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام" میں اسماعیلی عقائد کی ایک تفصیلی فہرست دی ہے۔ اس میں سے بہت تھوڑے سے عقائد زیر نظر کتاب میں دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب نے وہ تمام عقائد اسماعیلیوں کی معتبر اور مستند کتابوں کے حوالہ سے لکھے تھے۔ چونکہ اسماعیلیوں کی کتابیں لوگوں کے سامنے نہیں آتیں اسلئے ان کے عقائد اور رسومات کے متعلق لوگوں کو یقینی طور پر کچھ بھی معلوم نہیں۔ ہم اس مذہب کے ذمہ دار حضرات (بوہروں اور خوجوں) دونوں سے مشورۃً گذارش کریں گے کہ وہ اپنے عقائد اور رسومات کے متعلق اپنی دعوت کی طرف سے ایک مستقل کتاب شائع کریں جس میں یہ صاف الفاظ میں لکھا ہو کہ اس کے علاوہ ان کے ہاں کی مذہبی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے اسے باطل یا منسوخ سمجھا جائے۔ اس کے بعد دنیا سمجھ سکے گی کہ اس مذہب کے صحیح عقائد و رسوم کیا ہیں۔ بہر حال اگر ہم صرف ان عقائد ہی کو صحیح سمجھ لیں جو زیر نظر کتاب میں دیئے گئے ہیں تو ایسے عقائد رکھنے والوں کو قرآن سے تو کچھ واسطہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ نہ صرف یہ کہ قرآن سے ان کی کوئی سند نہیں ملتی بلکہ یہ قرآن کی تعلیم کے یکسر خلاف ہیں۔ ان عقائد کی سند احادیث سے پیش کی جاتی ہے یا اقوالِ ائمہ سے۔

۴۔ اسلام اور غلامی

مصنفہ مفتی سید عبدالقیوم صاحب وکیل (جالندھری) ضخامت ۴۸ صفحات۔ طباعت کتابت کاغذ عمدہ۔ قیمت بلا جلد دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ محبوب بکڈپو کوٹھی ملٹن روڈ۔ لاہور۔

مفتی عبدالقیوم صاحب ان اہل علم حضرات میں سے ہیں جو اسلامی قانون پر بالغ نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے تشکیلِ پاکستان کے بعد تعزیراتِ پاکستان کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی جو شرعی سزاؤں اور مستثنیاتِ عامہ پر مشتمل تھی۔ زیر نظر کتاب میں انھوں نے پہلے غلامی کے رواج کی ابتداء اور مختلف قدیم ممالک میں غلامی کی نوعیت اور کیفیت کے متعلق بحث کی ہے اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت عرب میں غلاموں اور لونڈیوں کی کیا صورت تھی۔ پھر یہ بتایا ہے کہ قرآن نے کس طرح اس وقت کے موجودہ غلاموں کو آہستہ آہستہ معاشرہ کا جزو بنا لیا اور آئندہ کے لئے کس طرح غلامی کا دروازہ کلیتہً بند کر دیا۔ کتاب قانونی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور مختصر ہونے کے باوجود اپنے مقصد کو نہایت عمدگی سے پورا کرتی ہے۔ ما ملکت ایمانکم کی بحث خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہے۔

ہم تعلیم یہ پاکستان آرمی ایجوکیشنل کور کا شش ماہی رسالہ ہے جس کا دوسرا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ آدھا پرچہ اردو میں ہے اور آدھا انگریزی میں۔ اردو کے حصہ کی طباعت ٹائپ میں ہوئی ہے۔ تشکیل پاکستان کے بعد ہماری قوم کے تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک اچھا خاصا حصہ فوج کی طرف جا رہا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ان نوجوانوں کے دل اور دماغ کی تربیت صحیح انداز سے ہو جائے تو یہ چیز ہمارے مستقبل کی درخشندگی کی آئینہ دار ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان تک اعلیٰ پایہ کا لٹریچر پہنچایا جائے جس میں ان کے علم کی سطح اور سلامتیٔ ذوق کا لحاظ رکھتے ہوئے قرآن کے بنیادی حقائق کو اس انداز میں پیش کیا جائے کہ وہ علیٰ وجہ البصیرت تسلیم کر لیں کہ فی الحقیقت یہی وہ تعلیم ہے جو انسانیت کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا اطمینان بخش حل اپنے اندر رکھتی ہے۔ جب ان کے دل میں اس قسم کا یقین محکم پیدا ہو جائے گا تو پھر ان کی قوت بازو تعمیر انسانیت کے لئے وہ کچھ کر دکھائے گی جسے قرآن مجاہدین فی سبیل اللہ کی خصوصیت کبریٰ قرار دیتا ہے۔ زیر نظر رسالہ کا انداز بتا رہا ہے کہ اس کے مرتبین اس کی ترتیب میں محنت سے کام لیتے ہیں۔ ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ ہمارے پیش کردہ مشورہ پر بھی غور فرمائیں تاکہ ان کی یہ محنت اور بہتر نتائج پیدا کر سکے۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ رسالہ میں براہ راست لکھنے والوں کے مضامین ہی درج کئے جائیں۔ دوسرے رسائل سے بہترین مضامین کا اخذ کر لینا کچھ معیوب نہیں ہے۔

سلیم کے نام

خطوط کا مجموعہ

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا تھا۔ دوسرا ایڈیشن پریس میں ہے۔ جن حضرات کی فرمائشیں موصول ہو چکی ہیں انھیں تھوڑے دنوں تک اور انتظار کرنا ہوگا۔

کتاب جلد تیار ہو جائے گی۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی

رفتارِ عالم

لندن میں ستمبر کے آخر میں جمعیت یورپ (E.D.C.) کی خاکستر سے اتحادِ یورپ کا جو نیا منصوبہ تعمیر ہوا اس کی تفاصیل آگے چل کر پیرس میں طے ہوئیں۔ پیرس میں پندرہ اقوام کے وزرائے خارجہ جمع ہوئے اور انھوں نے چار معاہدے طے کئے۔ پہلے معاہدہ کے مطابق مغربی جرمنی کی تین قابض اقوام ـ امریکہ، برطانیہ اور فرانس ـ نے یہ اعلان کیا کہ وہ اپنا فوجی تسلط ختم کر دینگی۔ اس تسلط کی رو سے مغربی جرمنی کی آزادی محدود ہے کیونکہ قابض افواج اس کے اندرونی معاملات میں بہت حد تک دخیل ہیں۔ اس تسلط کے خاتمے کی ابھی تک کوئی قابلِ عمل شکل پیدا نہیں ہو سکی تھی ۱۹۵۲ء میں معاہدہ بون کے مطابق طے پایا تھا کہ جمعیت یورپ (E.D.C.) کا منصوبہ متشکل ہوتے ہی مغربی جرمنی کا فوجی تسلط ختم کر دیا جائیگا لیکن وہ منصوبہ ہی ختم ہو گیا۔ نئے معاہدے کی رو سے مغربی جرمنی کو پہلے سے بہتر شرائط میسر آگئی ہیں کیونکہ اسے قریباً مکمل آزادی مل گئی ہے۔ اب اتحادی اقوام کی فوجیں مغربی جرمنی اور مغربی برلن میں رہیں گی تو مگر وہ اندرونی معاملات میں دخیل نہیں ہوں گی اور ان کا مقصد "آزاد دنیا کا تحفظ" ہوگا نہ کہ مغربی جرمنی پر قبضہ۔

معاہداتِ پیرس

مغربی یورپ کے تحفظ کے سلسلے میں اہم ترین سوال یہ ہے کہ مغربی جرمنی کو کیسے مسلح کیا جائے تاکہ اس کی فوجیں عمومی دفاع کے کام تو آسکیں لیکن وہ ہمسایہ اقوام کیلئے پھر سے خطرہ نہ بن جائیں۔ اسی خطرے کی روک تھام کیلئے جمعیت یورپ کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا جو کامیاب نہ ہو سکا۔ اب اس کی شکل یہ پیدا کی گئی ہے کہ معاہدہ برسلز کی تنظیم (جس میں پانچ اقوام شامل تھیں اور جو ۱۹۴۸ء سے لیکر اب تک ادھوری پڑی تھی) کی توسیع کی جائے اور اسے مغربی یورپی یونین (W.E.U.) کا نام دیا جائے۔ اس میں مغربی جرمنی اور اٹلی دونوں کو شریک کر لیا گیا ہے۔ گویا اب اس کے سات رکن ہو گئے ہیں۔ یہ دوسرا معاہدہ پیرس میں طے ہوا ہے۔ تیسرے معاہدے کی رو سے مغربی جرمنی کو ناٹو میں شرکت کی باقاعدہ دعوت دی گئی ہے۔ یہی "یونین" یہ فیصلہ کریگا کہ اس کے ارکان کو زیادہ سے زیادہ کتنی فوج اور کتنے اسلحہ مہیا کریں۔ اس میں کسی قسم کی زیادتی ساتوں ارکان کی متفقہ رضامندی سے ہو سکے گی۔ یہ انتظام بھی کیا جائیگا کہ ہر قوم بالخصوص مغربی جرمنی طے شدہ مقدار کے مطابق ہی اسلحہ تیار کرے۔

چوتھا معاہدہ سار سے متعلق ہے۔ یہ علاقہ جس کا رقبہ ایک ہزار مربع میل ہے اور آبادی دس لاکھ، کوئی پچاس سال سے جرمنی اور فرانس کے مابین استخوانِ نزاع بنا چلا آ رہا ہے۔ زبان اور کلچر کے اعتبار سے اہلِ سار جرمن ہیں لیکن معیشت کے اعتبار سے سار فرانس کا ضمیمہ نظر آتا ہے۔ یہاں کوئلہ بہت زیادہ ہے جو اسلحہ سازی اور دیگر صنعتوں کیلئے ازحد ضروری ہے۔ اس اہمیت کی بدولت اس کی ملکیت پر جھگڑے ہوتے رہے اور ملکیت بدلتی رہی۔ دوسری جنگِ عالمگیر کے بعد جرمنی کی شکست ہوئی تو سار فرانس کے تسلط میں آگیا۔ فرانس نے اسے خودمختاری دیکر اس انداز سے چلایا کہ جرمن دوست پارٹیاں ابھر نہ سکیں اور معاشی طور پر سار فرانس سے ملحق رہے۔ اس دوران میں جرمنی سے متعلق جو مذاکرات بھی ہوئے ان میں فرانس کا تقاضا یہی رہا کہ وہ عمومی یورپی فیصلوں کو اسی صورت میں تسلیم کریگا جبکہ سار سے متعلق فیصلہ اس کے نزدیک قابلِ قبول ہو۔ جرمن چانسلر ایڈینار تو فرانس سے امتیازی سلوک روا رکھنے کے حق میں ہیں مگر جرمن رائے عامہ اس کیلئے تیار نہیں کیونکہ سار کو جرمن علاقہ ہی متصور کیا جاتا ہے نیز یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اگر سار اس طرح ہاتھ سے دیدیا گیا تو جو علاقے اس وقت روسی

قبضے میں ہیں ان کے ہاتھ سے جانے کا بھی خدشہ حقیقی ہو جائے گا۔ بہرحال اب جو معاہدہ سار کے متعلق ہوا ہے اس کے مطابق اس علاقے کو "یورپی" تصور کیا جائیگا نہ کہ جرمن یا فرانسیسی اور اسے ایک کمشنر کی تحویل میں دیا جائیگا جو نہ فرانس کا باشندہ ہوگا نہ جرمنی کا نہ سار کا۔ اس کمشنر کو مغربی یورپی یونین نامزد کریگا۔ یہ معاہدہ بذریعہ استصواب باشندگان سار سے منظور کرایا جائیگا اور استصواب میں جرمن دوست پارٹیوں کو کام کرنے کا پورا پورا موقع دیا جائیگا۔ اگر معاہدہ اس طرح منظور ہو گیا تو سار میں انتخابات کے ذریعہ ایک مجلس مقننہ بنائی جائیگی جسے سار کی طے شدہ حیثیت بدلنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔

روس اور اقوامِ مغرب

یہ معاہدات متعلقہ حکومتوں کی تصدیق کے بعد نافذ العمل ہوں گے۔ اس تصدیق کا عمل نئے سال سے ہی شروع ہو سکیگا۔ اس تین ماہ کے وقفے میں کیا حرص ظہور میں آتا ہے۔ اسکے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ ۳ درمیانی وقفہ میں روس کو اپنی چالیں چلنے اور مغربی یورپ کے اتحاد کو ناممکن العمل بنانے کا کافی موقع مل جائیگا۔ اسنے اس کی طرح اقوام متحدہ میں ڈال بھی دی ہے۔ تخفیف اسلحہ کا سوال آٹھ برس سے ناقابل حل چلا آرہا ہے۔ فریقین ایٹمی اسلحہ کو ممنوع قرار دینے پر متفق ہونے کے باوصف کوئی متفقہ تجویز طے نہیں کر سکے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ان دنوں پھر یہ مسئلہ پیش ہوا تو روس کی طرف سے جو تجویز پیش ہوئی اس سے ایسا مترشح ہوتا ہے گویا کہ وہ ایٹمی اسلحہ کی فوری ممانعت پر مصر نہیں ہوگا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ روس اقوام متحدہ کے دل میں یہ خیال پیدا کرنا چاہتا ہے کہ وہ تخفیف اسلحہ کیلئے تیار ہے۔ اگر ایسا خیال مغربی یورپ میں بھی عام ہو جائے تو مغربی جرمنی کی اسلحہ بندی کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جانے کا احتمال ہے کیونکہ اقوام یورپ یہ خیال کرنے لگ جائیں گی کہ جب تخفیف اسلحہ کے معاہدے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں تو جرمنی کی اسلحہ بندی کی فوری ضرورت نہیں رہتی۔ جنرل اسمبلی میں اقوام یورپ کو بہکانے کے علاوہ روس نے یورپ میں بھی چال چلی۔ معاہدات پیرس سے متعلق اس نے جو یادداشت اقوام مغرب کو بھیجی اس میں کہا گیا کہ یہ معاہدات جرمن عسکریت کی راہ ہموار کرنیوالے ہیں نیز یہ کہ اگر اقوام مغرب اس طرح اسلحہ بندی میں مصروف رہیں تو تخفیف اسلحہ کے مذاکرات بیکار ہو جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی روس نے پھر یہ تجویز پیش کی کہ دول اربعہ عظمیٰ کے نمائندے پھر سے ملیں اور پرامن اور جمہوری طریق سے وحدت جرمن کا منصوبہ تیار کریں۔

روس ان دنوں خصوصیت سے اس کوشش میں ہے کہ اقوام مغرب کو اپنی امن پسندی اور مفاہمت جوئی کا یقین دلائے۔ اس کی دو ایک مثالیں قابل ذکر ہیں۔ ان دنوں جاپان کی شمالی سرحد پر دو روسی ہوائی جہازوں نے ایک امریکی ہوائی جہاز کو مار گرایا۔ چونکہ اس سے پیشتر بھی اس قسم کے متعدد تصادم ہو چکے ہیں اسلئے امریکہ نے اس پر سخت احتجاج کیا۔ اسکے جواب میں روس کا رویہ مصالحانہ تھا۔ گو روس نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ امریکی جہاز جاپانی سرحد میں تھا لیکن اس نے اس حادثہ پر معذرت کا اظہار کیا۔ اسی طرح بالشویک انقلاب کی سالگرہ کی تقریب پر روسی وزیر اعظم جارجی مالنخوف نے پہلی بار امریکی سفیر سے ملاقات کی اور دونوں کے مابین کوئی چالیس منٹ تک گفتگو ہوتی رہی جس کے دوران میں مالنخوف نے کہا کہ باہمی نزاع کو دور کرنے کیلئے سفیرانہ ذرائع سے کام لیا جائے۔ اسی طرح ایٹمی توانائی کے پرامن استعمال کیلئے بھی روس نے اسی مصالحت جوئی کا ثبوت دیا جو وہ تخفیف اسلحہ کے سلسلہ میں دکھا چکا تھا۔ اس کے نمائندے وائشنسکی نے یہ اعلان کیا کہ وہ روس بعض ترمیمات کے بعد صدر آئزن ہاور کی سال گذشتہ والی یہ تجویز ماننے کیلئے تیار ہے کہ ایٹمی توانائی کو اقوام متحدہ کی تحویل میں دیکر دنیا بھر کی ضروریات کیلئے استعمال کیا جائے۔ وائشنسکی نے روسی ترمیمات کے متعلق کچھ نہیں بتایا البتہ یہ خواہش کی کہ معاملہ حفاظتی کونسل کی تحویل میں دیا جائے۔ امریکہ اس تجویز کا مخالف ہے کیونکہ حفاظتی کونسل میں روس کو حق استرداد (ویٹو) حاصل ہے۔ امریکہ اسے جنرل اسمبلی کے سپرد اسلئے کرنا چاہتا ہے کہ وہاں کسی قوم کو بھی حق استرداد حاصل نہیں۔ روس نے حال ہی میں ایک اور تجویز پیش کی ہے۔ اس نے ۲۳ یورپی اقوام کو دعوت دی ہے کہ وہ ۲۹ نومبر کو ماسکو یا پیرس میں "موتمر تحفظ یورپ" میں شریک ہوں۔ اس تجویز میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسمیں سرخ چین اور امریکہ مشاہد کی حیثیت سے شریک ہوں گے۔ اقوام مغرب کے نزدیک یہ تجویز بدیہی طور پر قابل استرداد ہے۔

۲ر نومبر کو امریکی کانگرس کے جو انتخابات ہوئے اس میں صدر آئزن ہاور کی ری پبلکن پارٹی اکثریت حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ اس کے برعکس اکثریت

ڈیموکریٹک پارٹی کو حاصل ہوئی۔ ایوان نمائندگان میں ری پبلکن ارکان ۲۱۹ تھے لیکن اب وہ ۲۰۳ رہ گئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ڈیموکریٹ ۲۱۵ سے ۲۳۲ ہو گئے ہیں۔ ایوان کی کل تعداد ارکان ۴۳۵ ہے۔ سینیٹ میں ری پبلکن ۴۹ سے ۴۷ رہ گئے ہیں اور ڈیموکریٹ ۴۶ سے ۴۸ ہو گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صدر آئزن ہاور نے بڑی سرگرمی سے انتخابات میں حصہ لیا اگر وہ یہ سرگرمی نہ دکھاتے تو ان کی پارٹی کو بھاری شکست سے دوچار ہونا پڑتا۔ اب صورت یہ ہے کہ امریکہ کا صدر تو ری پبلکن پارٹی کا ہے لیکن کانگرس میں اکثریت ڈیموکریٹ کی ہے۔ موجودہ صدی میں یہ صورتِ حال تیسری مرتبہ پیدا ہوئی ہے۔ اس سے پیشتر صدر ولسن (۱۹۱۸) اور صدر ٹرومین (۱۹۴۶ء) کو اسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ صدر کا انتخاب دو سال بعد یعنی ۱۹۵۶ء میں ہوگا لیکن اس وقت یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ ری پبلکن پارٹی صدارتی انتخاب میں ضرور شکست کھا جائیگی بعض حلقوں میں یہ خیال جا رہا ہے کہ خود صدر آئزن ہاور دوبارہ انتخاب لڑنے کیلئے تیار نہیں ہوں گے لیکن آئزن ہاور نے یہ کہہ کر معاملہ کو مبہم بنا دیا کہ وہ مستقبل کے متعلق کچھ پیشین گوئی نہیں کر سکتے۔ بہرحال جہاں تک خارجہ حکمت عملی کا تعلق ہے اس پر ڈیموکریٹ فتح کا کوئی اثر نہیں پڑیگا۔

طغیانِ نیل دریائے نیل میں ایکبار پھر طغیانی آئی ہوئی ہے اور جنرل نجیب کی کشتی غرقاب کرنے پر منتج ہو چکی ہے۔ مصر کے بحرِ سیاست میں جس انداز سے نہنگ ابھرتے رہتے ہیں اس سے یہ نتیجہ نکالنا بیجا نہیں کہ اس میں سکون محال ہے۔ فوجی حکومت نے برسرِ اقتدار آکر اکتوبر ۱۹۵۳ء میں سیاسی جماعتوں کو یکقلم مٹا دیا تھا اور معمولی سیاسی زندگی کو ختم کر دیا تھا۔ اسوقت مصر کی سب سے زیادہ منظم اور وسیع جماعت اخوان المسلمون کو غیر سیاسی مذہبی جماعت قرار دیکر آزاد چھوڑ دیا گیا تھا لیکن اس سال کے آغاز یعنی جنوری میں اسے بھی خلاف قانون قرار دیدیا گیا اور اس کے کم و بیش ایک ہزار قائدین کو گرفتار کر لیا۔ اپریل میں اخوان اور بعض دیگر سیاسی جماعتوں کے قیدیوں کو اس خیال سے رہا کرنے کا سلسلہ شروع ہوا کہ ۲۳ جولائی کو فوجی انقلاب کی دوسری سالگرہ پر سیاسی جماعتوں کو پھر سے سرگرم کار ہونے کا موقع دیدیا جائے گا لیکن یہ فیصلہ درہم برہم ہو کر رہ گیا کیونکہ خود فوجی قائدین کے مابین اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی۔ اس سال فروری کے آخر میں اچانک جنرل نجیب کو صدارت اور وزارتِ عظمیٰ سے ہٹا دیا گیا لیکن ایک فوجی کپتان کی مداخلت سے نجیب اور ناصر میں "صلح" ہو گئی اور جنرل نجیب پھر صدر بھی بن گئے اور وزیرِ اعظم بھی۔ لیکن دوسری سالگرہ کی تیاریوں کے سلسلہ میں پھر دونوں میں تصادم ہو گیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنرل نجیب کو برائے نام صدر بنا دیا گیا اور وزارتِ عظمیٰ پر کرنل ناصر نے قبضہ کر لیا۔ اس کے ساتھ یہ سلسلہ بھی شروع ہوا کہ فوج سے جنرل نجیب کے آدمی چن چن کر نکالے جانے لگے اور خود جنرل نجیب پر الزام لگایا گیا کہ وہ طلبہ اور فوج کو آمادہ بہ بغاوت کر رہے تھے۔ اگست میں جب نہر سویز کا تصفیہ ہوا تو گو توقع یہ تھی کہ اب نیل کا تلاطم تھم جائیگا لیکن اس سے اور ہنگامے ابھر آئے۔ اخوان المسلمون اس معاہدے کی مخالف تھی۔ اس جماعت نے کھلم کھلا کرنل ناصر کی حکومت کی مخالفت شروع کر دی اس پر اخوان اور حکومت کے مابین تصادم کا نیا دور شروع ہوا۔ اس جماعت کے قائد حدیبی نے ایک مرتبہ کرنل ناصر کو ایک خط میں لکھا کہ اسوقت آپ مصر کی گلیوں میں پھرتے ہیں تو جماعت کا آدمی آپ کو ہاتھ تک نہیں لگاتا لیکن اگر آپ باز نہ آئے تو نتائج خطرناک ہونگے۔ حکومت غالباً اخوان کی ہر دلعزیزی کے پیشِ نظر جماعت کے خلاف سختی سے کاروائی نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ یہ کوشش کی گئی کہ حدیبی کو معزول کرا دیا جائے اور ان کی بجائے کوئی قابلِ قبول قائد منتخب کرا لیا جائے۔ یہ کوشش ناکام ہو گئی اور جماعت نے پھر سے حدیبی کو ہی منتخب کر لیا۔ یہ معاملہ اندر اندر پکتا رہا تا آنکہ نومبر کے آغاز میں اسکندریہ میں ایک تقریر کے دوران میں ایک شخص نے کرنل ناصر پر پے در پے آٹھ فائر کئے۔ کرنل ناصر بچ گئے اور حملہ آور گرفتار کر لیا گیا۔ وہ اخوان کا رکن بتایا جاتا ہے اور اس نے عدالت کے سامنے بیان میں کہا کہ اس کے اقدام سے جنرل نجیب کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ اس پر مصری حکومت نے صدر نجیب کو برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گو پہلے خیال ان کے خلاف مقدمہ چلانے کا تھا لیکن اب اسے ترک کر دیا گیا ہے۔ نیز جنرل نجیب کو پنشن دینے کا بھی اعلان ہوا ہے بشرطیکہ وہ سیاست سے کنارہ کش رہیں۔

جنرل نجیب اس سازش میں شریک تھے یا نہیں، یہ حقیقت ہے کہ اس نئے خلفشار سے مصر میں عدم استحکام کا ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے جس کا اثر مصر کے معاملاتِ داخلہ و خارجہ پر گہرا پڑیگا۔ جنرل نجیب کے حکومت سے نکل جانے سے بھی مصر کے وقار کو کافی صدمہ پہنچے گا۔ جنرل نجیب عوام میں ہر دلعزیز تھے۔ نیز ان کے ناخنِ تدبیر نے ہی سوڈان کے مسئلہ کی عقدہ کشائی کی تھی۔ خود اہلِ سوڈان ان کی بڑی قدر کرتے ہیں، اور اگر وہ مصر سے الحاق کے حق میں تھے تو اس کی بہت حد تک وجہ سوڈان میں جنرل نجیب کی ہر دلعزیزی تھی۔ اب ہو سکتا ہے کہ سوڈان کی رائے عامہ مصر سے الحاق کے خلاف ہو جائے اور وہ آزادی کو مطمحِ نگاہ بنالے۔ واضح رہے کہ فروری ۱۹۵۳ء میں برطانیہ اور مصر کے مابین ایک معاہدہ طے پایا تھا جس کی رو سے فیصلہ ہوا تھا کہ تین سال کے عبوری دور میں حکومت کو سوڈانی بنا دیا جائے اور اس کے بعد ایک منتخب مجلس یہ طے کرے کہ آیا سوڈان کو مصر سے الحاق کرنا ہے یا آزاد ہونا ہے۔ برطانیہ کی انتہائی کوشش تھی کہ سوڈان کے سامنے دولتِ مشترکہ میں شرکت کا بھی انتخاب ہونا چاہئے لیکن اسے مصر نے تسلیم نہیں کیا۔ اب برطانیہ کی کوشش یہ ہے کہ سوڈان آزاد ہو جائے تاکہ اسے بعد میں حیلے بہانے سے دولت مشترکہ کا رکن بنا لیا جائے اور اس طرح اسے مصر سے علیحدہ کر لیا جائے۔ اس اثنا میں سوڈان میں سب سے اولین انتخابات منعقد ہوئے اور ان میں موجودہ وزیر اعظم الازہری کی نیشنلسٹ یونین پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی جو مصر سے الحاق کے حق میں ہے۔ ان دنوں الازہری لندن گئے ہوئے ہیں اور وہ برطانوی ارباب حکومت سے ملاقاتیں کر رہے ہیں۔ یہ ملاقاتیں مصری نقطۂ نگاہ سے تشویشناک ہیں کیونکہ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ آزادی کا تصور زیادہ دلکشی کا حامل بنتا جا رہا ہے۔ ان دنوں الازہری نے عرب لیگ میں شرکت کا ارادہ بھی ظاہر کیا ہے۔ ایسی شرکت آزادی کی صورت میں ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ برطانیہ انتظامی، معاشی اور مالی مدد کا سبز باغ دکھا کر سوڈان کو آزادی کی راہ پر لا رہا ہے۔ اندریں حالات ہو سکتا ہے کہ سوڈان مصر سے علیحدہ راہ اختیار کر لے۔ جنرل نجیب کی برطرفی پر سوڈان میں مظاہرے ہوئے اور اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ سوڈان کا مصر سے الحاق مشکل ہو جائیگا الازہری نے علانیہ تو ان خیالات کا اظہار نہیں کیا لیکن ان کے بیان سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان کے خیالات کیا ہیں۔ مصر کیلئے یہ صورت حال خوش کن نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کا علاج یہی ہے کہ مصر اپنا گھر صاف کرے۔

اخوان المسلمون کو ممنوع قرار دینے کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ مصر کے تعلقات شام سے خراب ہو گئے ہیں۔ مصر کو شکایت ہے کہ اخوان المسلمون کا مرکز شام میں بنتا جا رہا ہے اور وہاں مصر کے خلاف مظاہرے ہوتے رہتے ہیں۔ مصری حکومت عرصہ سے مطالبہ کرتی چلی آ رہی تھی کہ شامی حکومت ان کی سرگرمیوں کو روکے جب اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا تو مصر نے شام سے اپنا سفیر واپس بلا لیا۔

شمالی افریقی "بغاوت"

شمالی افریقہ میں پھر "بغاوت" کے شعلے بلند ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ اب کے یہ آگ الجیریا سے بھڑکی ہے جو مقابلتاً پرسکون تھا۔ الجیریا کا علاقہ قریباً قریباً فرانس میں مدغم ہو چکا ہے۔ اس کے نمائندے فرانسیسی اسمبلی میں جاتے ہیں اور بظاہر فرانسیسیوں کے دوش بدوش بیٹھتے ہیں۔ لیکن انھیں اپنے گھر میں حقیقی سیاسی اختیارات حاصل نہیں۔ نومبر کے شروع میں الجیریا میں ہنگامے شروع ہوئے اور ساتھ ہی ٹیونس اور مراکو میں بدامنی پھیل گئی۔ فرانس نے الجیریا میں سخت اقدام کیا۔ اور مزید فوج بھیجکر آزادی خواہ جماعت کو خلافِ قانون قرار دے کر اس کے رہنماؤں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ نیز اس نے حکومتِ مصر پر الزام لگایا کہ قاہرہ ریڈیو کی وساطت سے اہل الجیریا کو اکسایا جا رہا ہے۔ فرانس کا یہ غصہ بالکل بے جا ہے کیونکہ یہ ہو نہیں سکتا کہ شمالی

افریقہ کے مظلوم آزادی خواہوں سے ہمدردی کا اظہار نہ کیا جائے۔ نیز فرانس اسے بار بار فراموش کر رہا ہے کہ اگر الجیریا کو سیاسی رتبہ حاصل ہو جائے تو وہ کسی کے اکسانے میں نہیں آئیگا۔ الجیریا کا اضطراب اس اعتبار سے اور قابل فہم ہو جاتا ہے کہ مینڈس فرانس کی حکومت نے ٹیونس کو اندرونی خود مختاری دینے کا وعدہ کیا ہے اور اس سے متعلق مذاکرات بھی شروع کر دیئے ہیں اور یہ بھی اعلان کیا ہے کہ اس کے بعد مراکو پر غور کیا جائیگا لیکن اس نے الجیریا کے متعلق اپنی حکمت عملی کا اظہار نہیں کیا۔ لہٰذا الجیریا مجبور ہے کہ وہ اپنے حقوق کی خاطر جنگ کی طرح ڈالے لیکن فرانسیسی زیر داخلہ کے الفاظ میں الجیریا سے مذاکرات کی واحد صورت ہے اور وہ جنگ ہے۔ جہاں تک ٹیونسیا کا تعلق ہے پیرس میں مذاکرات جاری ہیں۔ وزیر اعظم ٹیونسیا ابن عمار نے ایک بیان میں اس قوی امید کا اظہار کیا ہے کہ مذاکرات کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن وہ ہوں گے یا نہیں اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔

ایران کا تیل پھر سے دنیا کی منڈیوں میں پہنچنا شروع ہو گیا ہے۔ تیل کے کارخانے تین سال بند رہنے کے بعد دنیا کی آٹھ بڑی کمپنیوں کی نگرانی میں چلنا شروع ہو گئے ہیں۔ ان تین سالوں میں ایران کے حالات نے کئی ناخوشگوار پلٹے کھائے۔ تیل کی آمدنی ختم ہو جانے کی بدولت معیشت کی راہیں تنگ ہو گئیں جس سے طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ اس سیاسی مدوجزر میں ڈاکٹر مصدق جنھوں نے تیل کے قومی بنانے کی مہم چلائی تھی ان کی حکومت الٹی اور وہ سزائے موت کے مستوجب قرار دیئے گئے۔ اس سزا کو بعد میں ان کی عمر رسیدگی کے لحاظ سے تین سال کی قید میں بدل دیا گیا۔ ان کے دست راست حسین فاطمی کو غداری کے جرم کی پاداش میں گولی سے اڑا دیا گیا۔ حسین فاطمی ڈاکٹر مصدق کے زمانۂ حکومت میں وزیر خارجہ تھے۔ جب ڈاکٹر مصدق کو گرفتار کر لیا گیا تو فاطمی روپوش ہو گئے۔ گذشتہ مارچ میں انھیں گرفتار کر لیا گیا اور مقدمہ چلا کے سزائے موت دے دی گئی۔ ان تین نازک سالوں میں ایران میں جو کچھ ہوا وہ بڑا پریشان کن اور افسوسناک ہے۔ لیکن اب اگر ایران سنبھل گیا تو ہو سکتا ہے کہ مافات کی تلافی ہو جائے لیکن جو قیمتی جانیں وہاں ضائع ہو چکی ہیں وہ تو کسی قیمت پر بھی واپس نہیں آ سکیں گی۔

عالم اسلام کا ایک خوش آئند واقعہ ترکی اور عراق کا اس امر پر اتفاق رائے ہے کہ وہ دفاعی نظم قائم کریں گے۔ عراق کے نئے وزیر اعظم نوری السعید نے اکتوبر میں ترکی کا دورہ کیا۔ دورے کے خاتمے پر ان کے اور وزیر اعظم ترکی کے دستخطوں سے ایک مشترکہ اعلامیہ شائع ہوا جس میں تحریر تھا کہ دونوں ممالک میں یہ قرار پایا ہے کہ دونوں ممالک فی الفور دفاعی نظم کی تشکیل کے لئے اقدامات کریں گے۔ یہ اتفاق رائے اس اعتبار سے خوش آئند ہے کہ عراق پہلا عرب ملک ہے جو ترکی کا حلیف ہونے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اس سے پیشتر عراق امریکہ سے فوجی استمداد بھی کر چکا ہے گویا اب توقع پیدا ہو گئی ہے کہ عراق پاکستانی ترکی معاہدۂ دفاع میں شریک ہو جائے گا۔ گو اس ضمن میں کوئی باقاعدہ کارروائی نہیں کی گئی لیکن ایک عرصہ سے عراق کا رجحان ایسا ہی پایا جاتا ہے۔ اگر یہ رجحان قوی نہ ہوتا تو عرب ممالک کی مخالفت کے علی الرغم عراق امریکہ سے فوجی مدد کی درخواست نہ کرتا۔ دیگر عرب ممالک بظاہر اس جداگانہ راہ عمل کو پسند نہیں کریں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں جس حد تک تشتت پایا جاتا ہے اس کے پیش نظر یہ توقع عبث ہے کہ وہ کسی ایک ملک کو مجبور کر کے عالمگیر دفاعی سلسلوں میں شریک ہونے سے روک سکیں گے۔ عراق کے اس اقدام سے مشرق وسطیٰ کے دفاع (MEDO) کے امکانات پھر سے روشن ہو گئے ہیں۔ گویا اب قدرے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس علاقے میں دفاعی منصوبہ کی تشکیل ہو جائے گی اس کیلئے لندن میں سلسلہ جنبانی شروع ہو گئی ہے لیکن اس کا نتیجہ کچھ وقت کے بعد ہی نکل سکے گا۔

"علاقۂ امن"

پنڈت نہرو جو ایک عرصہ سے چین کے دورے کے لئے پر تول رہے تھے بالآخر اپنا دورہ ختم کر چکے ہیں۔ یہ دورہ پنڈت جی کی بہت بڑی بازی تھی مگر وہ اسے جیت نہیں سکے۔ ویسے یہ بازی پنڈت جی کے جیتنے کی تھی ہی نہیں۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ چین سے غیر جارحانہ معاہدہ کرکے ایک طرف اقوام مغرب کو یہ یقین دلادیں کہ چینی پیشقدمی ان کی وساطت سے روکی جا سکتی ہے لہذا انھیں پنڈت جی کی خوشنودی کے لئے سیٹو جیسے اقدامات کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔ دوسری طرف وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اس طرح اقوام ایشیا کو اپنی طاقت کا رعب دیکر اپنے پیچھے چلانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ انھیں چین سے متعلق غلط فہمی تھی کہ وہ ان کی ہاں میں ہاں ملائے گا مگر جب پنڈت جی چینی قائدین سے ملے تو وہاں انھوں نے نقشہ ہی اور دیکھا۔ چینی اس کے لئے کوشاں تھے کہ ہندوستان کی وساطت سے ایشیا میں غیر جارحانہ دفاعی سلسلہ قائم کرلیا جائے تاکہ سیٹو کا تدارک ہوسکے اور ایشیا میں مغرب کے اثر دخل کی روک تھام ہوسکے۔ پنڈت جی نے چین جانے سے پیشتر چین اور ہندوستان کے وزرائے اعظم کے مابین ملاقات کو واقعاتِ عالم کا ایک واقعہ کہا تھا لیکن اس واقعہ کا نتیجہ دونوں کے حسب دلخواہ نہیں رہا۔ پنڈت نہرو کا "علاقۂ امن"[1] کا خواب چینیوں نے شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے کوشش کی کہ وہ چین سے کوئی ایسی ضمانت لے لیں کہ وہ دوسرے ممالک کے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا اور اس ضمانت کو ایشیائی ممالک کو دکھا کر انھیں "علاقۂ امن" میں داخل کریں اور مغرب کو چین کے عزائم امن کا یقین دلائیں تاکہ اسے یہ بھی خیال نہ رہے کہ پنڈت جی چین سے دوستی کا دعا رکھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی اشتراکی ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسی ضمانت دینا تو درکنار چینی پنڈت جی کو اقلیتی قوموں کی درسگاہ میں لے گئے جس میں "طالب علموں" کو مناسب تعلیم دے کر جنوبی ایشیا کے غیر جانبدار ملکوں کی سرحدوں پر "معلم اور قائد" بنا کر بھیجدیا جاتا ہے۔ اس درسگاہ کے معائنہ کا جو اثر پنڈت جی پر ہوسکتا تھا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ہندوستان کا اپنا یہ حال ہے کہ اس کی جو سرحد چین سے ملتی ہے وہ دو ہزار میل لمبی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پنڈت جی چین کے دورے سے چنداں مطمئن نہیں آئے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ دلچسپ ہے ایک موقعہ پر چین کے وزیر اعظم نے یہ خواہش ظاہر کی کہ ہندوستان کی انگیخت پر جس ایشیائی افریقی[2] کانفرنس کی تیاریاں ہو رہی ہیں

---

[1] اقوام متحدہ میں ایک گروہ قائم ہوا تھا جسے عرب ایشیائی گروہ کہا جاتا تھا۔ اس میں پاکستان اور ہندوستان سمیت ۱۳ ممالک شامل تھے۔ ہندوستان نے آہستہ آہستہ کوشش کرکے اس کا نام افریقی ایشیائی گروہ کرالیا تاکہ عربوں کے نام کے نکل جانے سے اس سے مسلمانوں کا انتساب نمایاں طور پر ظاہر نہ ہو۔ یہ بھی "علاقۂ امن" کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس سلسلہ کی دوسری کڑی جس کی بنا پنڈت نہرو نے ڈالی۔ اس سال اپریل کے آخر میں کولمبو کانفرنس کا انعقاد تھا۔ اس میں پاکستان، ہندوستان، سیلون، برما اور انڈونیشیا شامل تھے اور یہی کولمبو ممالک کہلاتے ہیں۔ اب پنڈت جی کولمبو ممالک اور افریقی ایشیائی ممالک کو یکجا کرکے ایک اور طغوبہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں دسمبر کے آخر میں ایک کانفرنس انڈونیشیا میں منعقد ہو رہی ہے۔

[2] پنڈت نہرو کہنے کو مشرق و مغرب کی کشمکش میں غیر جانبدار رہنا چاہتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایشیا میں ایک "علاقۂ امن" پیدا کرنا چاہتے ہیں یعنی وہ ایشیائی اقوام کو اپنی طرح کا "غیر جانبدار" بنانا چاہتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ علاقۂ امن تیار ہو اور وہ اس کے قائد بن جائیں اور پھر روسی اور امریکی بلاکوں سے اپنا لوہا منوائیں۔ ایشیا میں ہندوستان کا سب سے بڑا حریف چین ہے جو قیادت کی عملاً طرح ڈال چکا ہے۔ تبت پر وہ قابض ہوچکا ہے۔ نیپال میں جسے ہندوستان اپنا حلقہ اثر کہتا ہے۔ اس کے گماشتے پہنچ رہے ہیں۔ برما میں اشتراکی گوریلے لڑائی لڑ رہے ہیں ہندچینی میں وہ آٹھ سال لڑتے رہے اور بالآخر فرانس نے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ تھائی لینڈ (سیام) ملایا، انڈونیشیا میں بھی اشتراکی بغاوت کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں چین ہندوستانی قیادت کے لئے کیسے راستہ صاف کرسکتا ہے اور ان ممالک سے کیسے واپس آسکتا ہے۔

. . . . . .

اس میں چین کو بھی دعوت شرکت دی جائے، تو پنڈت جی نے جواب میں کہا کہ انہیں یہ اہتمام تو کولمبو ممالک کی طرف سے ہو رہا ہے وہ ذاتی طور پر دعوت دینے کے مجاز نہیں۔

ہنگامی حالات پاکستانی بساطِ سیاست پر جو کھیل کھیلا جا رہا تھا اس کا نقشہ نومبر کے طلوع اسلام میں پیش کیا جا چکا ہے۔ حالات جو نوعیت اختیار کرتے جا رہے تھے اس کے پیش نظر ہی خواہان ملک وملت کی نظریں ایک بار پھر گورنر جنرل کی طرف اٹھنا شروع ہو گئیں۔ کیونکہ ملک میں سیاسی زندگی کے فقدان کی بدولت ایسے ادارے موجود نہیں ہیں جو وقت آنے پر حرکت کر سکیں اور حالات کی درستی کے ضامن ہو سکیں۔ یہ فریضہ ایک طرف سیاسی جماعتوں کے کرنے کا تھا، دوسری طرف ان کی نمائندہ مجالس مقننہ کا لیکن بدقسمتی سے دونوں صورتیں مایوس کن تھیں۔ ان حالات میں گورنر جنرل اپنے خصوصی اختیارات سے ہی کام لے سکتے تھے۔ حالات ایسے سنگین ہو چکے تھے کہ وزیر اعظم، جو دورۂ امریکہ پر تشریف لیگئے تھے، دورہ مختصر کر کے بعجلت تمام پاکستان واپس آ گئے۔ ان کے آنے پر گورنر جنرل نے ان سے مشاورت کے بعد ملک کو بچانے کی واحد صورت یہی دیکھی کہ ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا جائے۔ چنانچہ ۲۴ اکتوبر کو یہ اعلان کر دیا گیا اور اعلان کے الفاظ میں "آخری اختیار عوام کو تفویض کر دیا گیا"۔ نیز یہ اعلان ہوا کہ عوام نئے انتخابات کے بعد جملہ مسائل بشمول مسائل آئین کا حل تلاش کریں گے۔ ہنگامی حالات کا اعلان کرنے کے بعد گورنر جنرل نے وزیر اعظم محمد علی کو دعوت دی کہ وہ اپنی حکومت کی تشکیلِ نو کریں۔ نئی حکومت ابھی تک مکمل نہیں ہوئی، جو وزراء اب تک لئے گئے ہیں اس میں جنرل محمد ایوب کمانڈر انچیف کو بہ حیثیت وزیر دفاع لیا گیا ہے۔ عمومی اعتبار سے گورنر جنرل کے اس اقدام کا ملک بھر میں خیر مقدم کیا گیا لیکن یہ محسوس کیا جانے لگا کہ اگر مسائل کا حل پھر سے سیاسیین کے سپرد کر دیا گیا تو وہ پھر پہلی سی پیچیدگیاں اور فساد پیدا کر دیں گے، لہٰذا انسب یہی ہے کہ ملک کی بنیادیں اس طرح استوار کر دی جائیں کہ ان پر غلط عمارت اٹھائی ہی نہ جا سکے۔

نئی حکومت کے سامنے کرنے کے دو کام ہیں۔ ایک تو یہ کہ نظم معیشت کو ایسا درست کیا جائے کہ اشیائے صرف ضرورت کے مطابق اور واجبی داموں میں میسر آ سکیں۔ اس سلسلہ میں امریکہ سے معاہدہ ہو چکا ہے جس کی رو سے جون ۱۹۵۵ء کے آخر تک امریکہ کی طرف سے جو مدد ملنا تھی وہ کوئی چالیس کروڑ روپے تک کر دی گئی ہے۔ اس اضافہ شدہ امداد کے مطابق اشیائے ضروری جنوری کے مہینے میں آنا شروع ہو جائیں گی۔ حکومت امریکہ نے اپنے وہ قواعد پاکستان بھیج دیئے ہیں جن کے مطابق ایسی امداد ملتی ہے۔ ان قواعد پر غور ہو رہا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ تمام تفاصیل جلد طے کر لی جائیں گی۔ امداد کا پاکستانی معیشت پر کیا اثر پڑیگا اس کا صحیح اندازہ تو امداد پہنچ جانے پر ہی کیا جا سکے گا لیکن اس وقت ایسے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ امداد ملنے پر کنٹرول رفتہ رفتہ ختم کر دیئے جائیں اور ہنگامی پابندیاں اٹھا دی جائیں۔ بظاہر قیاس یہی ہے کہ مال کی موجودگی میں قیمتیں خود بخود مناسب سطح پر آ جائیں گی لیکن ملک جس ناگوار حالات سے دوچار رہا ہے اور ہے اس کے پیش نظر ضرورت ہوگی کہ تجارت پر نگاہ رکھی جائے تاکہ منافع خور تاجر پھر سے ملک کو معاشی بحران کی نذر نہ کر دیں۔

وحدت کی اساس حکومت کے سامنے دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ پاکستان کے مستقبل کی بنیاد کس طرح وحدت پر رکھی جائے۔ پاکستان

ملتِ اسلامیہ نے حاصل کیا تھا لیکن قیامِ پاکستان کے بعد ملت عملاً صوبوں میں بٹ گئی اور اس سے فکر و نظر میں وہ فساد پیدا ہوا کہ الامان والحفیظ۔ اس کا علاج یہی ہے کہ پاکستان کا دستور صوبائی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ ملی مفاد کی تکمیل کی غرض سے مرتب کیا جائے تاکہ اس میں ایسے رخنوں کو مطلقاً جگہ نہ مل سکے جو وحدتِ پاکستان کو مخدوش بنا دیں۔ اب تک حکومت کی طرف سے جو اعلانات ہوئے ہیں ان سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ مغربی پاکستان کو ایک یونٹ بنا دیا جائیگا اور صوبوں کا وجود ختم کر دیا جائے گا۔ واحد یونٹ کے فوائد ظاہر ہیں' ان پر کئی بار تبصرہ آچکا ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ پاکستان ایک قوم کا ملک ہوگا نہ کہ کئی اقوام کا۔ گو یہ بھی صورت ہو سکتی ہے کہ سارا پاکستان وحدانی طرزِ حکومت پر چلایا جائے یعنی صرف ایک مرکزی اسمبلی ہو لیکن دو حصص ملک کے مابین فاصلے اور دیگر بعض امور کے پیشِ نظر دوسری صورت یہ ہے کہ مغربی پاکستان کو ایک یونٹ بنا دیا جائے اور ایک اسمبلی مغرب میں ہو' ایک مشرق میں اور تیسری مرکز میں۔ یا مشرق اور مغرب کے درمیان کا نفیڈرسی قائم کر دی جائے۔ اس طرح وحدت کا تصور بھی پیدا ہو جائے گا اور مشرق و مغرب میں توازن کی صورت بھی نکل آئے گی۔ چنانچہ ایسے نظر آتا ہے کہ نئی حکومت ایک یونٹ کی تفاصیل طے کر رہی ہے اور عنقریب حکومتی فیصلے سے ایک یونٹ بنا دیا جائیگا۔ بلکہ یہ جو اعلان ہوا ہے[1] کہ ۲۲ نومبر کو وزیر اعظم اہم اعلان نشر کریں گے' اس کے متعلق بعض حلقوں میں یہ قیاس آرائی ہو رہی ہے کہ یہ اعلان اسی یونٹ سے متعلق ہوگا۔ بہرحال اندازہ یہی ہے کہ ایک یونٹ بنا دیا جائیگا اور پھر اس کی بنا پر نئے انتخابات عمل میں لائے جائیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس دوران میں ایک آئین بھی مرتب کر لیا جائے اور اسی آئین کو انتخابات کا ایشو بنایا جائے۔ گویا نئی مجلس دستور ساز اس آئین کو منظور کرے۔ یہ تجویز بوجوہ قابلِ ترجیح ہے۔ اس کے مطابق ایک تو آئین جلدی مرتب ہو جائے گا' دوسرے وہ طے شدہ اصولوں کے مطابق ہوگا۔ یوں بھی سابقہ تجربے کی بنا پر مناسب یہی ہے کہ چند ماہرین طے شدہ اصولوں کے مطابق دستور مرتب کر دیں بجائے اس کے کہ غیر ماہرین سیاستدانوں کے سپرد پھر سے یہ معاملہ کیا جائے اور برسوں کی تاخیر کیلئے گنجائش پیدا کی جائے۔

ایک یونٹ بنا دیا گیا تو ذہنیتوں میں کیسے وحدت کا خیال سما جائیگا' اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب مرکز میں وہ طائفہ برسرِ اقتدار تھا جو ذاتی استیلا کیلئے وحدتِ مغرب کو بنظرِ استحسان نہیں دیکھتا تھا' اس وقت مغرب میں کئی سربراہ ایسے مل جاتے تھے جو وحدت کی مخالفت کرتے تھے۔ سندھ میں پیرزادہ کا نام اس ضمن میں خصوصیت سے لیا جا سکتا ہے۔ وہ اس طائفہ کی شہ پر اپنے آپ کو ایک "طاقت" سمجھنے لگ گئے تھے حالانکہ مہینوں تک وہ حریفوں کے چیلنج کے باوصف اسمبلی کا اجلاس تک بلانے کیلئے تیار نہیں ہوئے۔ وہ علانیہ وحدتِ مغرب کو سندھ اور پاکستان کے مفاد کے منافی کہتے تھے اور ان کے حواری ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے تھے۔ اب ان کی وزارت کو برطرف کر دیا گیا ہے۔ یہ واضح رہے کہ چونکہ پیرزادہ صاحب سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف رہتے تھے اس لئے ان کے عہدِ وزارت میں نظم و نسق اور امن و قانون کی حالت بڑی ناگفتہ بہ ہوگئی۔ اس کا اعتراف ان کے حامیوں کی طرف سے بھی ہوتا تھا۔ ان کی وزارت کو بدنظمی کی وجہ سے برخاست کر دیا گیا ہے اور ان کی بجائے مسٹر کھوڑو کو وزیر اعلیٰ بنایا گیا ہے۔ پیرزادہ صاحب اس سے تو انکار نہ کر سکے کہ انھوں نے صوبے کی حالت کیا بنا دی تھی البتہ جاتے جاتے انھوں نے "شہادت" کا درجہ حاصل کرنے کی یوں کوشش کی کہ بیان کے ذریعے اپنی برطرفی کی یہ وجہ بتائی کہ انھیں ایک یونٹ کی مخالفت کی سزا دی گئی ہے۔

---

[1] یہ سطور ۲۲ نومبر سے پہلے لکھی جا چکی تھیں کہ بعد میں محترم وزیر اعظم صاحب کی تقریر نے یہ امر واضح کر دیا جس کی تفصیلات وغیرہ سے اسی پرچہ کے لمعات میں گفتگو کی گئی ہے۔ اس کو ملاحظہ فرمالیں۔

حالانکہ سوال صرف یہ ہے کہ کیا پیرزادہ صاحب کی "کارگزاریوں" کے پیش نظر انھیں برطرف کیا جاسکتا تھا یا نہیں؟ اس کا جواب پیرزادہ صاحب سے بہتر کون جان سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس طرف سے سب کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔ بہرکیف ان کے برطرف ہونے کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ خود سندھ میں ایک یونٹ کی حمایت شروع ہوگئی ہے۔ خود صوبے کے وزیراعلیٰ ایک یونٹ کے حق میں ہیں۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ مخالفینِ وحدت عوام کی ترجمانی کے نام پر ذاتی استحکام کی خاطر ملک میں تفرقہ اندازی کر رہے تھے۔ اسی طرح خیرپور کی اسمبلی نے بھی ایک یونٹ کی حمایت کی ہے اور اس میں جذب ہوجانے پر آمادگی کا اظہار کیا ہے حالانکہ اس سے پیشتر اس ریاست کی طرف سے، سندھ کی طرح، علیحدہ کلچر تک کی باتیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ کہاں جداگانہ کلچر کے دعوے اور کہاں وحدت میں گم ہوجانے کی تیاریاں!

ان دنوں ریاست بھاولپور کی وزارت اور اسمبلی کو بھی برطرف کر دیا گیا ہے۔ یہ برطرفی بھی بدنظمی اور نااہلیت کی بنا پر عمل میں لائی گئی ہے۔ اب ریاست کا انتظام ایک مشیر کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ یہ حیران کن بھی ہے اور افسوسناک بھی کہ پاکستان کی متعدد وزارتیں نااہلیت کی بنا پر برطرف ہوئیں یا ہو رہی ہیں۔ اس سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ملکت میں اہلیت کار کی کمی ہے اور یہ وجہ بھی وحدتِ مغرب کے حق میں جاتی ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اہل آدمی مرکز میں آکر ملکی مفاد کے لئے کام کرسکیں گے۔

تکمیل کابینہ

مرکزی حکومت ابھی تک مکمل نہیں ہوئی۔ اس کی تکمیل کا اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں مشرقی پاکستان کی کیا جگہ ہوگی۔ یہ صوبہ اسوقت دفعہ ۹۲ (و) کے زیر اثر ہے اس کی اسمبلی میں یونائٹڈ فرنٹ کی اکثریت ہے اور اس کی قیادت عملاً مسٹر سہروردی کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ مسٹر سہروردی نے اپنے متعدد بیانات میں گورنر جنرل کے اقدام کی حمایت کی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ انھیں کابینہ میں شرکت کے لئے دعوت دی گئی ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس پر آمادہ ہوجائیں گے یا نہیں لیکن اس کا اثر مشرقی پاکستان پر ضرور پڑیگا۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں گورنری راج ختم کر دیا جائے اور پارلیمانی حکومت بحال کر دی جائے لیکن سوال یہ ہے کہ وہاں حکومت کس کی بن سکتی ہے۔ یونائٹڈ فرنٹ میں اس پر اتفاق نہیں پایا جاتا۔ اس کے قائد ابھی تک فضل الحق ہیں لیکن عوامی لیگ جو فرنٹ میں اکثریت کی مالک ہے اور صوبے میں ہی نہیں بلکہ پاکستان کے دوسرے حصوں میں بھی شاخیں رکھتی ہے، ان سے متفق نہیں۔ یوں بھی فضل الحق کے کردار کی بدولت ایک اچھا خاصا طبقہ ان کے خلاف ہوچلا ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ صوبے کے وزیراعلیٰ وہ بنیں۔ یوں تو یونائٹڈ فرنٹ کبھی بھی پوری طرح متحد نہیں تھا لیکن اب اس میں مزید رخنے پیدا ہوگئے ہیں۔ ان حالات میں عوامی لیگ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور اسی لئے مسٹر سہروردی کی بھی۔ لہٰذا مسٹر سہروردی کے فیصلے پر بہت کچھ دارومدار ہے۔ وہ نومبر کے آخر میں پاکستان پہنچ جائیں گے اور ان کے آنے پر تبدیلیوں کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ان دنوں گورنر جنرل ڈھاکے سے ہوآئے ہیں وہاں ان کا جس طریق سے استقبال ہوا اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صوبہ ان پر پورا اعتماد رکھتا ہے۔

حکومتی تبدیلیوں سے لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب حکومت کی خارجہ پالیسی کیا ہوگی؟ ہماری خارجہ پالیسی کے دو اہم پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ امریکہ سے ہمارا تعلق کیا ہوگا اور دوسرا یہ کہ ہندوستان سے کیا تعلق ہوگا؟ نئی حکومت یقیناً امریکہ کی حلیف ہوگی، کیونکہ امریکہ سے جو فوجی معاہدہ ہوا ہے اس کی داغ بیل خود گورنر جنرل نے ڈالی تھی۔ دوسرے محمد علی صاحب وزیراعظم بھی امریکہ کے حامی ہیں اور وہ حال ہی میں امریکہ کا دورہ کرکے مزید معاشی امداد حاصل کرکے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اعلان کیا گیا ہے کہ نئی حکومت کی خارجہ حکمت عملی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

جہانتک ہندوستان کا تعلق ہے اس کے متعلق پھر سے ایسے حالات پیدا ہو رہے ہیں کہ مذاکرات کا نیا سلسلہ شروع ہو جائے۔ نئی حکومت میں ڈاکٹر خان صاحب کی شمولیت کو اس اعتبار سے بھی اہم سمجھا گیا ہے کہ وہ ہندوستان سے تنازعات حل کرنے میں ممد ہوں گے۔ خود گورنر جنرل بھی اس سلسلہ میں ذاتی دلچسپی لے رہے ہیں، چنانچہ ڈھاکہ تشریف لیجاتے ہوئے وہ راستہ میں ہندوستان رکے تو انھوں نے پنڈت نہرو کو ذاتی پیغام بھیجا جس میں کہا کہ وہ دونوں مل کر ان تنازعات کو ختم کر سکتے ہیں۔ ان تنازعات میں قابل ذکر تنازعۂ کشمیر اور دریائی پانی کے ہیں۔ کشمیر کے متعلق فیصلہ تھا کہ اسے پھر سے حفاظتی کونسل میں پیش کیا جائے لیکن نئے وزیر کشمیر نے اعلان کیا ہے کہ وہ پہلے آزاد کشمیر کے معاملات کو سلجھائیں گے اور پھر کشمیر کے اصلی مسئلہ کی طرف توجہ دیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کشمیر کے مسئلہ کو فوری طور پر نہیں اٹھایا جائیگا۔ اگر اس دوران میں ہندوستان سے براہ راست مذاکرات شروع ہو گئے تو پھر اس کے علیحدہ اٹھانے کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ جہانتک نہری پانی کا تعلق ہے وہ عالمی بنک کے پیش نظر ہے۔ اس سلسلہ میں مذاکرات کا نیا سلسلہ دسمبر میں شروع ہوگا۔ کیا ہندوستان باہمی تنازعات کے حل کرنے میں ممد ثابت ہو سکے گا؟ سات سال کا تجربہ اس کا جواب اثبات میں دینے کے حق میں نہیں ——— لیکن اگر پاکستان اندرونی استحکام کر سکا جس کے آثار پیدا ہو گئے ہیں، تو ہندوستان کے رویہ میں تبدیلی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اسلئے کہ ——— عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد۔

محررہ - ۲۱ر نومبر ۱۹۵۴ء

دیکھئے۔ اپنا خریداری نمبر تلاش کیجئے

دسمبر ۱۹۵۴ء کی اس اشاعت کے ساتھ آپ حضرات کا چندہ (جن کے نمبر خریداری درج ذیل ہیں) ختم ہو گیا ہے لہذا آئندہ ماہ جنوری ۱۹۵۵ء کا پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی بھیجا جائیگا۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ۲۰ر دسمبر سے پہلے پہلے آپ اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دیں کہ اس میں ادارہ کو سہولت اور آپ کو کفایت ہے اور اگر کسی وجہ سے خدانخواستہ آپ رسالہ کی خریداری آئندہ جاری رکھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں تو بھی ۲۰ر دسمبر سے پہلے پہلے ادارہ کو اپنے اس فیصلہ سے مطلع فرما دیں ورنہ ادارہ کی طرف سے مرسلہ وی پی کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہوگا۔

فہرست خریداران جن کا چندہ ماہ دسمبر کی اشاعت کے ساتھ ختم ہو رہا ہے۔

۲۲ - ۳۱ - ۵۱ - ۵۶ - ۵۷ - ۵۹ - ۶۴ - ۸۲ - ۸۵ - ۱۲۰ - ۱۲۴ - ۱۲۸ - ۱۵۳ - ۱۵۴ - ۱۶۶ - ۱۶۸ - ۱۷۱ - ۱۷۳ - ۱۸۲ - ۱۸۴
۱۹۰ - ۱۹۱ - ۱۹۲ - ۱۹۷ - ۱۹۹ - ۲۲۴ - ۲۷۰ - ۲۸۰ - ۲۸۴ - ۲۹۰ - ۳۰۹ - ۳۲۰ - ۳۲۱ - ۳۲۶ - ۳۴۰ - ۳۴۲ - ۳۵۴ - ۳۵۸
۳۶۷ - ۴۱۴ - ۴۱۵ - ۴۱۷ - ۴۱۸ - ۴۱۹ - ۴۲۰ - ۴۲۱ - ۴۲۲ - ۴۴۵ - ۴۷۸ - ۴۹۴ - ۵۲۵ - ۵۲۹ - ۵۶۰ - ۵۶۵ - ۵۹۵ -
۵۹۶ - ۵۹۷ - ۶۰۰ - ۶۰۳ - ۶۰۷ - ۶۰۸ - ۶۱۴ - ۶۲۰ - ۶۲۲ - ۶۲۷ - ۶۲۸ - ۶۲۹ - ۶۳۵ - ۶۵۰ - ۶۵۱ - ۶۵۴ - ۶۵۹ -
۶۶۵ - ۶۷۰ - ۷۰۲ - ۷۰۳ - ۷۱۲ - ۷۱۹ - ۷۴۹ - ۸۲۰ - ۸۵۸ - ۹۵۳ - ۱۰۱۳ - ۱۰۲۸ - ۱۰۳۶ - ۱۱۶۹ - ۱۱۹۷ - ۱۱۹۸ - ۱۲۰۱ - ۱۲۰۲
۱۲۱۶ - ۱۲۲۰ - ۱۲۲۴ - ۱۲۲۶ - ۱۲۲۸ - ۱۲۳۳ - ۱۲۳۷ - ۱۲۴۳ - ۱۲۴۵ - ۱۲۴۶ - ۱۲۵۷ - ۱۲۵۹ - ۱۲۶۲ - ۱۲۶۳ - ۱۲۶۴ - ۱۲۶۹ -
۱۲۷۰ - ۱۲۷۵ - ۱۲۷۹ - ۱۲۸۱ - ۱۲۸۴ - ۱۲۸۸ - ۱۲۸۹ - ۱۲۹۰ - ۱۲۹۴ - ۱۲۹۷ - ۱۲۹۸ - ۱۳۰۵ - ۱۳۱۰ - ۱۳۱۲ - ۱۳۱۴ - ۱۳۲۳ - ۱۳۲۵ -
۱۳۳۰ - ۱۳۷۵ - ۱۴۳۲ - ۱۴۹۳ - ۱۵۳۹ - ۱۵۴۳ - ۱۶۳۸ - ۱۶۶۶ - ۱۷۰۸ - ۱۷۰۹ - ۱۷۱۱ - ۱۷۲۲ - ۱۷۲۷ - ۱۷۲۸ - ۱۷۴۰ - ۱۷۴۴ - ۱۷۴۵ -
۱۷۴۷ - ۱۷۵۷ - ۱۷۶۱ - ۱۷۶۵ - ۱۷۶۶ - ۱۷۶۷ - ۱۷۶۹ - ۱۷۷۰ - ۱۷۷۱ - ۱۷۷۷ - ۱۷۷۸ - ۱۷۷۹ - ۱۷۸۲ - ۱۷۸۳ - ۱۷۸۴ - ۱۷۹۰ - ۱۷۹۱ - ۱۷۹۲
۱۷۹۳ - ۱۷۹۴ - ۱۷۹۵ - ۱۷۹۶ - ۱۷۹۷ - ۱۷۹۸ - ۱۷۹۹ - ۱۸۰۰ - ۱۸۰۲ - ۱۸۰۳ - ۱۸۰۶ - ۱۸۰۸ - ۱۸۰۹ - ۱۸۱۱ - ۱۸۱۲ - ۱۸۱۵ - ۱۸۱۶ -
۱۸۱۷ - ۱۸۱۸ - ۱۸۱۹ - ۱۸۲۰ - ۱۸۲۱ - ۱۸۲۳ - ۱۸۲۵ - ۱۸۲۶ - ۱۸۲۷ - ۱۸۲۸ - ۱۸۲۹ - ۱۸۳۰ - ۱۸۳۴ - ۱۸۸۴ - ۱۸۸۵ - ۱۸۸۶ - ۱۸۸۷ -
۱۸۸۸ - ۱۸۸۹ - ۱۸۹۴ - ۱۹۰۰ - ۱۹۱۰ - ۱۹۱۲ - ۱۹۲۵ - ۱۹۴۹ - ۱۹۵۶ - ۱۹۵۷ - ۱۹۶۳ - ۱۹۷۵ - ۱۹۸۱ - ۱۹۸۴ - ۲۰۵۰ - ۲۰۵۸
۲۰۵۹ - ۲۰۶۰ - ۲۰۶۱ - ۲۰۶۲ - ۲۰۶۳ - ۲۰۶۴ - ۲۰۷۳ - ۲۱۱۵ - ۲۱۳۶ - ۲۱۳۷ - ۲۱۴۱ - ۲۱۵۴ - ۲۲۵۱ -

نوٹ: چندہ ارسال فرمانے سے پہلے طلوع اسلام کی ہفتہ واری اسکیم کو ملاحظہ فرمالیں جو صفحہ ۱۳ پر درج ہے۔

ادارۂ طلوع اسلام کی مطبوعات ایک نظر میں

اسلامی نظام دورِ حاضرہ کی ایک بلند پایہ کتاب جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے نظام اور آئین کے بنیادی اصول کیا ہیں وہ نظام آج کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ اس میں محترم پرویز صاحب اور علامہ اسلم جیراجپوری کے وہ مقالات شامل ہیں جنہوں نے قوم کے سنجیدہ طبقہ کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ضخامت ۲۸۴ صفحات قیمت مجلد مع گردپوش دو روپے۔

قرآنی دستورِ پاکستان آئینی جدوجہد کے سلسلے میں ادارۂ طلوع اسلام کی پیشکش قرآن کی روشنی میں سودۂ قرارداد مقاصد و بنیادی اصول و حقوق جو حکومت کے اعلان کے جواب میں بھیجے گئے۔ ساتھ ہی حکومت کی جانب سے پاس کردہ قرارداد مقاصد اور بنیادی اصولوں کی پہلی رپورٹ پر قرآن کی روشنی میں تنقید۔ مولوی صاحبان کے بائیس نکات کا تجزیہ۔ اسلامی جماعت کے دستوری سفارشات پر تبصرہ ضخامت ۳۴۴ صفحات مجلد مع گردپوش۔ دو روپے آٹھ آنے۔ (علاوہ محصول ڈاک)

نوادرات علامہ حافظ محمد اسلم کے نادر مضامین کا قابل قدر مجموعہ ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قیمت صرف چار روپے۔

اسبابِ زوالِ امت (پرویز) دورِ حاضرہ کی انقلاب آفریں کتاب۔ مختصر مگر ہماری ہزار سالہ تاریخ کا نچوڑ جس نے قوم کے سنجیدہ تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ صحیح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا۔ ضخامت ۱۵۰ صفحات مجلد طلائی گردپوش۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

قرآنی فیصلے دورِ حاضرہ کی ایک اہم کوشش جس میں روزمرہ زندگی کے تقریباً ساٹھ اہم مسائل و معاملات کے متعلق قرآن کی روشنی میں بحث کی گئی ہے کہ ان مسائل اور معاملات میں قرآن پاک کا کیا فیصلہ ہے۔ یہ کتاب آپ کو دوسرے تمام سہاروں سے بے نیاز کر دے گی۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد مع گردپوش چار روپے۔

جشن نامے بلند حقائق کا مجموعہ اور عبرت و موعظت کا مرقع۔ ایسے ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر بیک وقت آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ طنز اور تنقید کے ایسے گہرے نشتر! اثر و درد کے ایسے خونچکاں منظر شاید ہی کہیں مل سکیں۔ یہ کتاب ہمارے سات سالہ دورِ آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ ہے۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت مجلد مع گردپوش دو روپے آٹھ آنے۔

معراجِ انسانیت: مفصل اشتہار صفحہ ۳ پر ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت بیس روپے۔

سلیم کے نام خطوط: ” ” ۶۳ ” ” قیمت چھ روپے

مزاج شناسِ رسول ” ٹائیٹل کے دوسرے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت چار روپے۔

اسلامی معاشرت ” ” آخری ” ” قیمت دو روپے

مقامِ حدیث ” ” ” ” ۔ قیمت جلد اول چار روپے۔ جلد دوم چار روپے

ادارۂ طلوع اسلام پوسٹ بکس ۷۳۱۳۔ کراچی

اگر بنیاد کمزور ہے تو ۔

... مکان کبھی پختہ نہیں بن سکتا ۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی قوم صحیح اسلامی کردار کی حامل ہو تو ....

بچوں کو صحیح اسلامی تعلیم دیجئے ۔

صحیح اسلامی تعلیم کے لئے ایسی کتاب کی ضرورت ہے جس میں اسلام کی صحیح صحیح تصویر پیش کی گئی ہو ۔

یہ کتاب ہے ۔

اسلامی معاشرت

جسے جناب پرویز نے بچوں عورتوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے خاص طور پر لکھا ہے ۔

اور جسے ادارہ طلوع اسلام نے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے ۔

ضخامت ۱۹۲ صفحات ۔ قیمت (مجلد مع گرد پوش) -/۲ روپے ۔

(علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ ۔ کراچی

قرآن اور حدیث

کیا یہ ٹھیک ھے ؟

ٹھیک ھے تو کسطرح ۔ اور غلط ھے تو کیوں ؟

کیا ان دونوں کی حیثیت ایک جیسی ھے ؟

اگر نہیں تو پھر ان کی حیثیت کیا ھے ؟

ان تمام اھم سوالات کے تفصیلی جواب کے لئے ۔

مقام حدیث

ملاحظہ کیجئے جس میں آپ کو احادیث کے متعلق اتنی معلومات حاصل ھونگی جو کسی اور جگہ یکجا نہیں مل سکینگی ۔

کتاب دو جلدوں میں مکمل ھوئی ھے ۔ ھر جلد کی ضخامت قریب چارسو صفحات اور قیمت فی جلد (مجلد سعہ گردپوش) چار روپیہ (علاوہ محصول ڈاک) ۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی

Only Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Rd., Karachi. and Text at Adabi Press, Robson Road, Karachi Published by Said Amhed from Tulu-e-Islam Office Karachi.